ماہنامہ

مجلہ

حیاتِ نو

بڑیا گنج

حق کے آگے سر جھکانا اور ناحق
کے آگے سر جھکانے پر موت کو ترجیح دینا ایک
شریف قوم کا خاصہ ہونا چاہیے اور اگر وہ
اعلائے حق اور اعانت حق کی قوت نہ رکھتی
ہو تو اسے کم از کم تحفظ حق پر سختی کے ساتھ
ضرور قائم رہنا چاہیے جو شرافت کا کم سے
کم درجہ ہے۔

(مودودیؒ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ حیات نو بلریاگنج

جلد ۱۰	ربیع الثانی۔جمادی الاول ۱۴۱۳ھ ستمبر/اکتوبر ۱۹۹۲ء	شمارہ ۹

بدل اشتراک

سالانہ زر تعاون	۵۰/۰۰ روپے
طلبہ کے لئے	۴۰/۰۰ روپے
خصوصی زر تعاون	۱۰۰/۰۰ روپے
اعزازی زر تعاون	۱۰۰۰/۰۰ روپے
غیر ممالک سے زر تعاون	۲۵ امریکی ڈالر
قیمت فی شمارہ	۵/۰۰ روپے
اس شمارہ کی قیمت	۷/۰۰ روپے

مدیر مسئول
نور محمد فلاحی
مدیر
محمد اسمٰعیل فلاحی
معاون مدیر
عبد البر اثری فلاحی

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہٰذا جلد سالانہ زر تعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ
دفتر ماہنامہ مجلہ حیات نو جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ
۲۶۹۱۲۱

فون نمبر ۷۱۸۱۵ نشاط آفسٹ پریس ٹانڈہ

ایک اہم اعلان

انجمن طلبہ قدیم کی شوریٰ نے اپنی گذشتہ میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ تمام فلاحی برادران کی علمی کاوشیں انجمن کی مرکزی آفس میں جمع کی جائیں۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں ہمیں آپ کا تعاون درکار ہے۔ تعاون کی شکلیں حسب ذیل ہیں۔

- وہ برادران جن کی کاوشیں شائع ہو چکی ہیں وہ اپنی مطبوعات کی دو دو کاپیاں روانہ فرمائیں۔
- وہ برادران جن کی کاوشیں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں وہ ان کی دو دو فوٹو کاپیاں روانہ فرمائیں۔
- واضح رہے کہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے بھی مطلوب ہیں۔
- آپ کے علم میں فلاحی برادران کی جو بھی کاوشیں ہوں ان کی فہرست اور ملنے کی شکلوں سے آگاہ کریں۔
- اس ضمن میں کوئی دشواری درپیش ہو تو دفتر انجمن سے رابطہ قائم کریں۔

والسلام
سکریٹری انجمن
محمد عمران خان فلاحی

نقوشِ حیاتِ نو

		صفحہ
ادارتیہ		
نصابِ تعلیم — کچھ غور طلب امور	محمد اسمٰعیل فلاحی	۳
بحث ونظر		
ہندوستان میں ترکوں کی فتح کے اسباب	محمد صہیب ندوی	۱۰
اندلس میں عربی زبان وادب کا ارتقاء	ڈاکٹر محمد احمد فلاحی	۲۰
نظامِ تعلیم	پروفیسر خورشید احمد	۲۱
غیر تعلیم یافتہ طبقے میں دعوت کا کام	خرم جاہ مراد	۵۲
لکھ رہا ہوں جنوں میں		
ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔	ابواللسان تقویٰ	۵۵
وفیات		
مولانا نجم الدین اصلاحیؒ، ماسٹر قدرت اللہؒ	محمد اسمٰعیل فلاحی	۶۳
شعر ونغمہ		
تقدیس	ادریس ضیا، نصیر احمد عاصی	۵۴
غزلیں	سالک بستوی، مدہوش بلگرامی ایم اے، کیفی	۵۲، ۶۳، ۶۴
غزلیں	قمر رام نگری، آزاد وصفیہ	۶۵، ۷۱
تعارف وتبصرہ		
وقت کی اہمیت	عبدالصبر اثری فلاحی	۶۶
جامعہ کے لیل ونہار		
جامعۃ الفلاح پہلے نمبر پر، اجلاس مجلس منتظمہ، ایک علمی تحفہ، وضوگاہ	محمد اسمٰعیل فلاحی	۶۹
حلقۂ یاراں	اظہار الدین فلاحی، واصف اقبال	ٹائٹل ۲، ۳

ادارتیہ — محمد اسمٰعیل فلاحی

نصابِ تعلیم — کچھ غور طلب امور

تعلیم کسی قوم کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہے۔ تعلیم کے مختلف عناصر ہیں۔ استاد، ماحول، نصابِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم۔ میری گفتگو اس وقت نصابِ تعلیم تک محدود رہے گی۔ تعلیم کیا ہو، کن چیزوں کی ہو، اس سلسلہ میں نبیؐ کے ارشاداتِ گرامی اس کی سرحدوں کی وسعت اور ہمہ گیری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ آپؐ نے جہاں خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (مسلم) (تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور اس کی تعلیم دے) ارشاد فرمایا، وہیں اپنے بچوں کو تیر اندازی، تیراکی وغیرہ سکھانے کا حکم دیا اور جب عیسائیوں اور یہودیوں کے خطوط ومعاہدات کے ضمن میں ضرورت محسوس فرمائی تو صحابۂ کرام کو عبرانی زبان سیکھنے کی تلقین کی۔ یہ اتنے واضح نشاناتِ راہ تھے کہ ہمارے اسلاف نے ہمیشہ ان کا لحاظ رکھا اور اپنے نصابِ تعلیم میں زمانے کے تقاضوں اور ضرورتوں کی رعایت رکھی۔ حضرت علیؓ نے اپنے دور کے لحاظ سے بجا فرمایا تھا۔

العلوم خمسة الفقه للأديان والطب للأبدان والهندسة للبنيان والنحو للسان والنجوم للزمان۔	علم پانچ قسم کے ہیں۔ فقہ دین کیلئے، طب جسم کے لئے، انجینئرنگ تعمیرات کیلئے، نحو زبان دانی کے لئے اور علم نجوم وقت کے لئے۔

دورِ عباسی میں یونانی منطق وفلسفہ وغیرہ کے زیرِ اثر اسلامی عقائد پر حملے شروع ہوئے تو وقت کے نبض شناس علماء نے ان علوم کو شجرِ ممنوعہ سمجھنے کے بجائے، ان میں استادانہ مہارت پیدا کی، انہیں اپنے یہاں داخلِ نصاب کیا اور یوں منطق وفلسفہ اور طب ونجوم میں یونانیوں پر اپنا علمی تفوق ثابت کرکے اسلام پر ہونے والی خشت باری کا رخ پھیر دیا۔ ہماری دینی درسگاہوں میں یہ منطق وفلسفہ اور علمِ کلام آج بھی داخل ہیں اور انہیں علومِ دینیہ کا جزءِ لاینفک تصور کر لیا گیا ہے۔

لہ آل انڈیا فلاح کونسل کی جانب سے دہلی میں منعقد ہونے والے کل ہند دینی مدارس کنونشن منعقدہ ۲۳، ۲۴، ۲۵ ستمبر ۱۹۸۰ء کے لئے یہ مضمون تحریر کیا گیا تھا۔

علمائے کرام کے سامنے مقصد متعین تھا، منزل واضح تھی۔ وہ راستہ کے نشیب و فراز سے خوب واقف تھے، ضرورت اور وقت کے مطابق انہوں نے راہیں نکالیں۔ بایں نصب العین نگاہوں سے کبھی اوجھل نہیں ہوا اور منزل ہمیشہ نظروں کے سامنے رہی۔ ان کا توسع تو اس حد تک تھا کہ ضرورت پڑنے پر انہوں نے عرب و خلاف شیعہ تصنیف "نفحۃ الیمن" مکر و فریب اور چوری کے واقعات کا مجموعہ "مقامات حریری" اور "سبع معلقات" جیسی حیاسوز اور اخلاق باختہ کتابیں اپنے نصاب میں رکھیں جو آج تک داخل نصاب ہیں اور ساتھ ساتھ ان کتابوں کے مسموم اثرات سے اپنے طلبہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔

اصولی طور پر ماضی قریب کے علماء بھی یہ بات تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا قول ہے "اس کے بعد (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی" (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج دوم ص۲۰۳) سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں قدیم و جدید علوم کا مشترک نصاب کیوں نہیں رکھا گیا؟ اس کا جواب مولانا نانوتویؒ کے الفاظ میں "زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے" (سوانح قاسمی ج دوم ص۲۸۳) مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے نزدیک "لغت انگریزی کا پڑھنا یا انگریزی لکھنا سیکھنا اگر بہ لحاظ تشبہ ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لئے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے آگاہ ہو سکیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضورؐ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو یہود کا خط (عبرانی) سیکھنے کے لئے حکم فرمایا تو انہوں نے تھوڑے ہی دنوں میں اسے سیکھ لیا" (مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی ص۳۰۳)

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی رائے تھی۔

"انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آئے" (فتاوی رشیدیہ ج اول ص۹۲)

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دور میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا فتوی یہی تھا کہ انگریزی

پڑھنا جائز ہے" (تاریخ دارالعلوم دیوبند ج دوم ص۲۰۳)

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قیام کے موقع پر فرمایا تھا "آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوم کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوی نہیں دیا" (موج کوثر ص۹)

لیکن ان مشائخ کے ان گراں قدر خیالات کے باوجود یہ تلخ حقیقت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے کہ ایک لمبے عرصہ سے ہمارا نصاب تعلیم ایک طرح کے تعطل اور جمود کا شکار ہے، ضرورت تھی کہ زمانہ کے مطابق قرآن و سنت کی روح سامنے رکھتے ہوئے اسلاف کی طرح ہم بھی اپنے نصاب تعلیم کا جائزہ لیتے رہتے اور جدید تدریسی طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے اسے زندہ نصاب بناتے۔ میرا احساس ہے کہ اس پہلو سے بڑی کوتاہی ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر آج سماجی علوم مثلاً سیاسیات و اقتصادیات کی راہ سے جو الحاد آ رہا ہے اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے اسی طرح تیراکی، تیر اندازی وغیرہ کے مقابلہ میں راکٹ، ریڈار اور سٹلائٹ کا دور ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے وسیع تر مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے "و اعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخیل" (ان کے مقابلے کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے) تیار رہو اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو (انفال: ۶۰)

اور "علموا اولادکم الرمی والسباحة" (اپنی اولاد کو تیر اندازی اور تیراکی سکھاؤ) کی روشنی میں ان علوم سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ علماء اس جانب سے بالکل غافل رہے ہوں، وقتاً فوقتاً نصاب بہتر بنانے کی انہوں نے کوششیں کی ہیں، تاہم اس جانب خاصی پیش رفت کی ضرورت ہے۔ ابھی تک ہمارے مدرسوں میں اسی یونانی علم کلام کا دور دورہ ہے جو عرصہ ہوا اپنی افادیت کھو چکے، اور وہ فرقے بھی موت کی نیند سو گئے اور ان جدید علوم کی طرف ابھی تک کوئی توجہ نہیں ہے۔

صرف یہی نہیں کہ ہمارے نصاب جدید علوم سے خالی ہیں، بلکہ متعدد قدیم مضامین کی ایسی کتابیں داخل نصاب ہیں جن کا طرز تالیف نصابی کتابوں جیسا نہیں، اور جن سے طلبہ

کرنا، وقت کا ساتھ دینا ہوتا ہے۔ ضرورت انہیں نئے سرے سے مدون اور مرتب کرنے کی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ نظری طور پر ان جدید علوم کی اہمیت سب کو تسلیم ہے۔ ان علوم کی تحصیل کو کوئی کفر اور شرک نہیں سمجھتا لیکن یہ سمجھ کر عملاً ان کو رد کیا جاتا ہے کہ قدیم علوم ان سے متاثر ہوں گے اور دوسرے یہ کہ جدید علوم اپنے ساتھ بہت سے مسموم اثرات لے کر آئیں گے اور ان سے زندقہ اور الحاد کو راہ ملے گی۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں سبع معلقات جیسی کتابوں سے اپنے نصاب کو پہلے پاک کرنا چاہئے۔ ان کتابوں کے برے اثرات سے قرآن و سنت اور اساتذہ کے مضبوط کردار کی بنا پر جس طرح ہمارے طلبہ محفوظ رہتے ہیں، ان جدید علوم کی سمیت سے بھی محفوظ رہیں گے۔ دوسرے یہ کہ یونانی علم کلام کو ہم مسلمان بنا سکتے ہیں تو ان علوم کو ہم مسلمان کیوں نہیں بنا سکتے۔ تیسری بات یہ کہ ان علوم میں فی نفسہ کوئی کفر و فسق نہیں ہے۔ خرابی ان دماغوں میں ہے جن کا ان علوم پر آج قبضہ ہے۔ ہمیں ان علوم کو دھو دھا کر ان کی آلودگیوں سے پاک کرنا اور انسانیت کے لئے مفید بنانا چاہئے۔

یہ بات ہمارے درمیان تسلیم شدہ ہے، جس سے کسی کو مجال اختلاف نہیں کہ دینی مدارس کا مشن علوم دینیہ کے ماہرین اور قرآن و سنت کے حاملین پیدا کرنا ہے۔ ہم عصری علوم کے ایسے امتزاج کے قائل نہیں ہیں جس سے یہ مشن متاثر ہوتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ پرانے نصاب سے ان غیر ضروری علوم کو خارج کر دیا جائے جن کی آج ضرورت نہیں۔ بعض مضامین کے طرز تدریس کی کچھ اصلاح ہو جائے تو ان عصری علوم کے لئے گنجائش نکل سکتی ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے سب سے پہلے اصلاح نصاب کی جانب عملی قدم اٹھایا تھا لیکن اس راہ میں وہ تنہا تھا اور وسائل مفقود تھے۔ کچھ عرصہ قبل جامعۃ الفلاح بلریا گنج نے اس جانب خاصی پیش رفت کی ہے جس کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ تاہم ابھی بہت اصلاح کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے اصلاح نصاب کا یہ وسیع کام کسی ایک فرد یا تنہا ایک ادارہ کے بس کی بات نہیں اس کے لئے سب کو مل کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اصلاح نصاب کے ضمن میں ٹکنیکل تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ چاہئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں جہاں طب کی تعلیم کا خصوصی نظم تھا وہیں کتابت، جلد سازی

ٹیلی، ہول ٹول اور سوٹ کیس وغیرہ بنانے کی ہلکی پھلکی صنعتیں بھی سکھائی جاتی تھیں۔ آج جدید دور کے مطابق جدید ٹکنالوجی کی تعلیم وقت کا اہم تقاضا ہے۔

یہ سوال کہ طالب علم یہ سارے علوم کیسے حاصل کر سکتا ہے، بہت زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اختصاص کا دور ہے۔ ایک ایک علم کی شاخ در شاخ تشکیل جاری ہے پہلے کی طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک آدمی بیک وقت مختلف علوم کا ماہر ہو۔ ہمیں بھی اپنے نصاب کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ ایک خاص معیار تک مثلاً ہائی اسکول تک۔ تو ہم کو قدیم و جدید تمام ضروری علوم کی بنیادی تعلیم دینی ہوگی۔ اس کے بعد طالب علم اپنے رجحان و مذاق کے مطابق کسی ایک شعبہ علم کے لئے یکسو ہوگا۔ اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ جدید علوم میں سے کسی ایک علم میں اور دعوت و تبلیغ کے پیش نظر کسی ایک بین الاقوامی یا علاقائی زبان میں بھی مہارت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

اگر ہم نے اس جانب توجہ نہیں کی تو پھر ہمیں یاد رکھنا چاہئے زمانہ بڑا برق رفتار ہے کل تک جو انقلابات بیل گاڑیوں اور چھکڑوں کی پیٹھ پر آیا کرتے تھے آج وہ ہوائی جہاز اور سٹلائٹ سے آ رہے ہیں۔ دنیا ایک گھر کے مانند سمٹ آئی ہے۔ علم میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ تعلیم و تربیت کے تحت نئے طریقے ایجاد ہوئے ہیں اور اس میں مسلسل ارتقا ہے۔ ترقی یافتہ قومیں ان سے آنکھیں بند نہیں کرتیں۔ زمانہ کے تقاضوں پر ان کی نگاہ رہتی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق وہ اپنے نظام تعلیم کو ڈھالتی اور نصاب تعلیم کو ہم آہنگ کرتی ہیں تعلیم و تربیت کے جدید ترین طریقوں سے استفادہ کرتی اور تعلیم میں ممد و معاون جدید ذرائع و وسائل کو بلا اندازہ استحقاق ٹھکراتی نہیں۔ ان کا نصاب تعلیم کسی میوزیم کی یادگار نہیں ہوتا وہ اس پر ہر آن اور ہر لحظہ نظر ثانی کرتی، فرسودہ اور از کار رفتہ پر خط نسخ پھیرتی اور مفید مطالب کو اپنے اندر سموتی رہتی ہیں۔ اگر ہم نے اپنی آنکھیں نہیں کھولیں تو اسی طرح ٹٹوؤں اور بیل گاڑیوں پر سفر کرتے رہیں گے اور مشین گنوں اور میزائلوں کے مقابلہ میں ہمارے ہاتھوں میں بس تیر و کمان اور تلوار

اس سلسلہ میں مشورہ ہے کہ ایک بورڈ تشکیل دیا جائے جس میں دینی ذہن رکھنے والے جدید و قدیم علوم کے ماہرین ہوں، وہ ایک جامع نصاب تیار کریں۔ اس نصاب کی تیاری

میں اساتذہ مدارس سے فوری استفادہ کیا جائے۔ ہر مضمون کے لئے مختلف جماعتوں کا ایک معیار بنا کر کتابوں کے انتخاب میں ایک گونہ آزادی ہو ساتھ ہی اس بورڈ کی نگرانی میں مختلف مضامین کے لئے از سر نو کورس کی کتابیں مدون کرائی جائیں اور کوشش کی جائے کہ ہمارے مدارس کے درمیان یکسانیت ہم آہنگی اور باہم تعاون کا جذبہ فروغ پائے اور اس بورڈ کے مطابق نصاب اور اس سے متعلق مدارس کو حکومت سے تسلیم کرایا جائے۔

قاہرہ کانفرنس

دم کٹی اس روایتی لومڑی کی طرح جس نے چاہا کہ سب کی دم کٹ جائے مغرب بھی آج بری طرح پریشان اور بدحواس ہے۔ اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ، روحانی اعتبار سے تباہ اور سماجی اعتبار سے زوال پذیر مغرب اب خود بھی خودکشی کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کی تہذیب بھی، سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی زیادہ دیر تک اس کی حفاظت نہیں کر سکتی اس کی اصل بیماری اس کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر، خدائی ہدایت سے اعراض اور تنہا اپنی عقل پر بھروسہ ہے اب وہ چاہتا ہے کہ اسی کی طرح ساری دنیا بھی بیمار ہو جائے۔ اس کے لئے تک تدبیریں اور سازشیں کرتا آئے دن اس کا معمول بن گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی جانب سے قاہرہ کانفرنس برائے آبادی و ترقی اسی طرح کی ایک شرارت ہے اور اس سے آگے بڑھ کر یہ ہے قتل کے منصوبے ہمارے گھر میں بیٹھ کر۔ اس معاملہ کا سب سے زیادہ سنگین اور دکھتا پہلو ہے۔ اس کانفرنس کے پیش نظر ترقی کے نام پر تحدید آبادی، مساوات مرد و زن کے نام پر عورتوں کا استحصال اور لازمی جنسی تعلیم، مانع حمل اشیاء کی بسہولت فراہمی اور اسقاط حمل کی سہولتوں کے ذریعہ جنسی بے راہ روی اور کنڈوم کلچر کو مشرق میں اور بالخصوص عالم اسلام میں فروغ دینا رہا ہے۔

حالانکہ زندگی کی سہولتوں اور خوراک کے وسائل میں آبادی کے تناسب سے بڑھ کر بے پناہ اضافہ پچھلی چند دہائیوں کے دوران ہوا ہے اور انسانی زندگی ایسی بے شمار ترقیات اور سہولتوں سے آشنا ہوئی ہے کہ پہلے عام انسان تو کجا، بادشاہوں کو بھی وہ چیزیں حاصل نہیں تھیں اصل مسئلہ ان کی منصفانہ تقسیم اور ترجیحات کا ہے۔

اسی طرح مخصوص حالات میں انفرادی سطح پر عزل وغیرہ کی اجازت دوسری بات ہے

لیکن اسے کلچر بنانا اور عالمی سطح پر نہ صرف ترغیب بلکہ دباؤ ایک ایسا معاملہ ہے جو بہر صورت اسلام سے متصادم اور متغائر ہے۔

ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم . (بنی اسرائیل ۳۱)	اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔

قرآن کی رو سے ایک جان کا ناحق قتل پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔

من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً . (المائدہ ۳۲)	جس نے کسی جان کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد مچایا ہو قتل کیا تو گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔

پھلوں کے آنے سے پہلے پھولوں کو نوچنا اور جھاڑنا اگر جرم ہے تو پیدائش کے ابتدائی مرحلہ میں ختم کرنے اور پیدا ہونے کے بعد گلا دبانے میں آخر کیوں فرق ہے؟ اسلام کا مزاج تحدید آبادی نہیں، کثرت آبادی ہے۔ جس سے یہ کنڈوم کلچر کسی طرح میل نہیں کھاتا نبی کا ارشاد

تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم	بہت محبت کرنے والی اور جننے والی عورتوں سے شادی کرو میں تمہارے ذریعہ امتوں کی کثرت میں مقابلہ کرونگا۔

مغرب نے وقت سے پہلے اپنے بچوں کو وہاں پہونچا دیا ہے جہاں وہ لازمی جنسی تعلیم کی ضرورت محسوس کرتا ہے یہ ہمارا مسئلہ قطعی نہیں ہے۔ مشرق عفت و عصمت کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا اور اسے آزادانہ جنسی اختلاط، ابتدائی عمر میں جنسی تعلیم نیز مانع حمل اشیاء اور اسقاط حمل کی سہولتوں کے ذریعہ قربان نہیں کر سکتا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اسلامی دنیا اور ویٹیکن سٹی کی حکمت عملی سے یہ کانفرنس اپنے مجوزہ مقصد میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکی۔

بقیہ صفحہ ۳۰ کا

تلمسان میں گزارے دہیں ان کی وفات ۸۷۳ھ میں ہوئی۔ مقری کے بقول ان کی متعدد تصانیف ہیں لیکن انہوں نے کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔

ہندوستان میں ترکوں کی فتح کے اسباب

جب ہم ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ متعدد اسباب نے ترکوں کی فتح میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ ذیل میں ان اسباب کا مختصراً تذکرہ کیا جارہا ہے۔

داخلی انتشار ——— ہرش وردھن کی سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان اپنے اندرونی انتشار میں مبتلا ہوگیا۔ مختلف راجاؤں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ تقریباً چار سو سال یعنی ۸۰۰ء سے ۱۲۰۶ء تک ہندوستان کی ہر ریاست علیحدہ علیحدہ راجپوت خاندان کے ماتحت تھی۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ میں چالاک حکمراں تھے۔ راجپوتانہ، سندھ اور پنجاب میں چھوٹے چھوٹے راجپوت راجے راج کررہے تھے۔ ان میں چوہان نمایاں تھے جن کی راجدھانی اجمیر تھی۔ ہمسایہ ریاستوں کے راجہ اور سرداروں میں اقتدار کی بڑی رقابت رہتی تھی اور آپسی جنگ و جدال میں مصروف رہا کرتے تھے۔ اس لئے وہ متحد ہوکر بیرونی حملہ آوروں کے مقابلہ میں ملک کی مدافعت نہ کرسکے۔

ترکوں کی فتح کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ راجہ برہمنوں اور پروہتوں کو خوش کرنے کے لئے بہت زیادہ مال و اسباب مندروں اور عبادت گاہوں کو دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے مندر اور عبادت گاہیں مال و اسباب سے بھری ہوئی تھیں۔ اس ذخیرہ اندوزی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مال و اسباب جو ملک کی ترقی اور اس کی حفاظت میں خرچ ہوتے وہ مندروں کی زینت بنے ہوتے تھے یہی وجہ ہے

کہ حملہ آوروں کی توجہ کا مرکز یہ مندر بھی رہے۔

جاگیردارانہ نظام ——— ہرش وردھن کے بعد آٹھویں صدی خاص طور سے راجپوت عہد میں ہندوستان چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ ریاستی حکمراں جس ریاست کو فتح کرتے تھے عام طور سے اس کے راجہ کو ماتحت بنا کر اس سے صرف خراج وصول کرتے تھے۔ ماتحت راجاؤں کی حیثیت محض جاگیردار کی ہوتی تھی۔ اور راجپوت حکمراں برہمنوں اور پروہتوں کو خوش کرنے کے لئے ان کو بڑی بڑی آراضیاں دیتے تھے۔ ہر جاگیردار کی ایک علیحدہ فوج ہوتی تھی۔ اس طرح آہستہ آہستہ جاگیرداروں کی طاقت بڑھ جانے اور اپنی فوج اکٹھا کرنے اور ٹیکس عائد کرنے کی وجہ سے سیاسی اقتدار منتشر ہوگیا تھا۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے زمیندار اور امراء طبقہ کے لئے مخصوص ہوگئے تھے۔ اس وجہ سے بادشاہ کا اقتدار کمزور ہوگیا تھا۔ ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کی نشوونما نے دوررس اثرات مرتب کئے۔ اس سے حکمراں کی حیثیت کم ہوگئی اور وہ جاگیرداروں اور سرداروں کا دست نگر بن گیا۔ اور یہ جاگیردار خود اپنی فوج رکھنے کی وجہ سے حکمرانوں سے مقابلہ بھی کرتے تھے۔ ہندوستانی ریاستوں کی اندرونی کمزوریوں نے بعد میں ترکوں کے ساتھ تصادم کے وقت نازک صورت حال پیدا کردی۔ چھوٹی ریاستوں نے تجارت کی ہمت افزائی نہ کی اور ایسی معیشت کی ہمت افزائی کی جس سے گاؤں انفرادی اور اجتماعی طور پر خود کفیل بن جائیں۔ جاگیردار سرداروں کے اقتدار نے گاؤں کی سیلف گورنمنٹ کو بھی کمزور کردیا۔

ذات پات کا نظام ——— ہندوستان کی شکست کی اصل وجہ ان کی سماجی معاشرتی اور غیر منصفانہ ذات پات کی تقسیم اور امتیازی برتاؤ

تھا جس نے تمام معاشرتی اور سیاسی اتحاد کو ختم کر دیا سماج چار طبقات میں بٹا ہوا تھا برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔

سب سے اعلیٰ برہمن سمجھے جاتے تھے جو مذہبی کاموں کے ذمہ دار تھے ان کو پروہت اور گرو کی حیثیت حاصل تھی۔ جن مراعات کا وہ مطالبہ کرتے تھے ان میں نذریں وصول کرنا، ٹیکس اور سزاؤں سے مستثنیٰ ہونا بھی شامل تھا۔ ورنوں کی درجہ بندی کے اعتبار سے چھتریوں کا دوسرا درجہ تھا۔ ان کا کام حکومت اور جنگ کرنا تھا۔ یہ تاجروں اور کسانوں سے وصول شدہ محاصل پر زندگی گزارتے تھے۔ ویش جو کھیتی باڑی، مویشی پالن، اور تجارت کرتے تھے۔ شودروں کا کام تینوں بالائی ورنوں کی خدمت کرنا تھا۔ عورتوں کی طرح انہیں بھی وید پڑھنے کی ممانعت تھی ان دونوں کے علاوہ اور بہت سی ذیلی ذاتیں تھیں۔

پروفیسر آر۔ ایس۔ شرما ترکوں کی فتح کا ایک اہم سبب ذاتوں کی افزائش بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں۔

یہ دور ذاتوں کی افزائش اور انتشار کا زمانہ تھا۔ موجودہ ورن مختلف ذاتوں میں منقسم ہو گئے تھے اور بہت سے قبیلے اور ذاتیں ان میں ضم ہو گئی تھیں۔ برہمنوں کی افزائش کا عمل غالباً سب سے زیادہ شدید تھا۔ بہت سے برہمن ذاتوں کے نام ان کے مذہبی رسومات کی ادائیگی کے طریقہ کار یا وید کے کسی خصوصی علم کے ماہرین کے مطابق رکھے جاتے تھے لیکن متعدد ذاتوں میں ان کی تقسیم کا سب سے اہم سبب گہری مقامیت کا فروغ تھا۔ اراضی سے متعلق دستاویزات میں برہمن کی شناخت کے مختلف طریقے ملتے ہیں کبھی ان گوتروں سے یا پھر ان کے مرد آباؤ اجداد کے ناموں کے ذریعہ بعض اوقات چار پشتوں تک چلتے تھے۔ یا پھر وید کے کسی خصوصی علم کے ماہر ہونے کی حیثیت سے یا سب سے آخر میں ان کے آبائی وطن کے

کے تعلق سے یعنی وہ گاؤں جہاں سے وہ آتے تھے۔

چھتری فرقہ کی افزائش کا خاص سبب کچھ نئے لوگوں کا وجود میں آنا تھا جن کو راجپوت کہا جاتا تھا۔ نسلی اور خاندانی فخر جتانا راجپوت کرتے تھے اتنا کوئی دوسرا گروہ نہیں کرتا تھا ان میں سے کچھ اس چھتری نسل سے تعلق رکھتے ہوں گے کتبوں میں حکمراں خاندانوں کو شمسی و قمری سلسلے سے منسوب کرنے کی ابتدا تقریباً ساتویں صدی عیسوی سے ہوئی۔ چالوکیہ، چندیل، پال وغیرہ مقامی قبائل تھے جن کو برہمن شجرہ نویسوں نے چھتری کے باعزت صف میں رکھا۔ درحقیقت چھتری ذات کی توسیع پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں تیزی سے کی گئی ہُنوں کی جیسے وسط ایشیائی لوگ اور گوجروں کو راجپوت کا درجہ مل گیا۔

قرون وسطیٰ کے آغاز میں سب سے زیادہ ذاتیں شودروں کی تھیں۔ قدیم ترین قانون کی کتابوں کے مطابق شودروں کی ذات سے پندرہ تک مخلوط ذاتیں تھیں اور جو شروع میں قبائلی گروہ تھے انہیں برہمن سماجی دائرہ میں اصیل یا غیر اصیل شودر کی حیثیت سے داخل کیا گیا تھا۔ غیر اصیل یعنی اچھوتوں کی تعداد میں اس بڑے اضافے کی وجہ بیان کرنا مشکل ہے۔ بیشتر اچھوت ذاتیں پسماندہ قبائل سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک اور اہم عمل جو شودر ذاتوں کی تعداد میں زبردست اضافے کا سبب بنا یہ تھا کہ پیشے ذاتوں میں تبدیل ہونے لگے چونکہ گپتا دور کے بعد کے زمانے میں تجارت اور کاروبار کی حالت خستہ ہو گئی اس لئے کاریگروں کی انجمنیں رفتہ رفتہ غیر فعال اور موروثی اور مقامی ہونے لگیں۔ پیشے اور انجمن رفتہ رفتہ ایسے چھوٹے اور علیحدگی پسند آدمیوں میں محصور ہو گئیں جو عملاً ذاتوں کے مماثل تھیں ایک اور سبب جس نے قرون وسطیٰ میں ذاتوں کی تعداد میں اضافہ کیا وہ لوگوں کا مذہبی الحاق تھا جو شیو مت، وشنو مت، بدھ مت، جین

مت کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا تھا۔ حالانکہ یہ مذہبی فرقے جو پیدائش کی بنیاد پر ذات کی تفریق مٹانے کے لیے وجود میں آتے تھے خود انہیں کو ذات کے نظام نے نگل لیا۔" (از مند وسطیٰ کے ہندوستان میں سماجی تبدیلیاں)

تجارت کا زوال ——— ہندوستان کی بیرونی تجارت پہلی اور دوسری صدی کے درمیان خوب زور و شور پر تھی۔ ہندوستان روم کے مشرقی علاقوں کو ریشم مصالحہ جات اور قیمتی دھاتیں برآمد کرتا رہا لیکن انہوں نے چین والوں سے ریشم کے کیڑے پالنے کا فن سیکھ لیا تو اب ان کو ہندوستان یا چین سے ریشم لینے کی ضرورت نہ رہی۔

پروفیسر آر۔ ایس شرما کا کہنا ہے کہ اغلب ہے کہ ہندوستان کے ساحلی علاقوں اور چین و جنوب مشرقی ایشیا کے درمیان کچھ تجارت ہوتی ہو جو ملک کے داخلی اقتصادیات پر بہت کم اثر انداز ہوتی تھیں۔ لیکن تجارت کے مجموعی زوال نے ساحلی اور اندرونی شہروں کے درمیان اور اسی طرح شہر اور گاؤں کے درمیان اقتصادی روابط کو کمزور کر دیا۔

اس دور میں سکوں کی کمیابی سے تجارتی زوال کی صاف نشاندہی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے سکوں کی کمیابی نے ملکی اور بیرونی تجارت کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور گاؤں کو خود انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی ضروریات پوری کرنی پڑیں۔ اتنی کثیر التعداد حکومتوں کا مطلب یہ تھا کہ متعدد چوکیوں پر محصول ادا کیا جائے جس سے تجارت کی جڑ اور بھی کھوکھلی ہو گئی۔

اس کے علاوہ سر جادوناتھ سرکار نے ترکوں کی کامیابی کے مندرجہ ذیل اسباب بیان کئے ہیں۔ ہندوستان پر جن ترکوں نے حملہ کیا تھا وہ مسلمان تھے اور اسلام نے اپنے پیروؤں کو تین مخصوص خصوصیات عطا کی تھیں۔ یہ فیضان

اور کسی دوسرے مذہب کی جانب سے اس کامیاب طور پر نہیں ہوا۔ ان صفات نے فطری طور پر جنگ باز عربوں، بربروں، پٹھانوں اور ترکوں کو مزید فوجی اہلیت بخشی یہ صفات مندرجہ ذیل ہیں۔

اول ——— قانونی حیثیت اور مذہبی سہولتوں کے لحاظ سے مکمل مساوات اور معاشرتی استحکام اور اس طور پر ذات اور نسل کے تمام امتیازات ختم ہو گئے اور یہ فرقہ ایک وسیع خاندان کے افراد اور بھائیوں کی طرح متحد ہو گیا۔

دوم ——— عقیدہ قضا و قدر کا قائل ہونا

جس کی اصل بنیاد خدا پر مکمل بھروسہ اور یہ اعتقاد تھا کہ اللہ کی مرضی تمام انسانی کوششوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے جنگ میں موت کا ڈر ختم ہو گیا۔

سوم ——— شراب نوشی سے نجات قرآن کے حکم کے مطابق شراب نوشی ایک گناہ ہے اور اس کی اسلام میں بہت سخت سزا ہے۔ اس کے برخلاف شراب نوشی راجپوتوں، مراٹھوں، اور دوسرے ہندوستانی فوجیوں کی خاص لعنت تھی اور اس نے ان کو دور بیں اور فوجی منصوبہ بندی، اچانک حملہ اور خود اپنے فوجی ٹھکانوں کی حفاظت کے قابل نہ رکھا۔ (History of INDIA)

پروفیسر حبیب ہندوستان میں ترکوں کی فتح کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شہروں میں صرف اونچی ذات کے لوگ رہ سکتے تھے۔ نچلے طبقہ والوں کو حکم تھا کہ وہ سورج طلوع ہونے کے بعد شہروں میں داخل ہوں اور سورج غروب ہونے سے قبل شہر سے نکل جائیں جس کی وجہ سے ہندوستانی عوام کی بڑی تعداد کے لئے ایسی کوئی شے نہ تھی جو ان کے اندر جذبہ حب الوطنی کو اس وقت ابھارتی جب کہ مقابلہ ترک حملہ آوروں سے ہوا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ذات پات کے نظام نے ہندوستانیوں کی فوجی کارکردگی پر کاری ضرب لگائی چونکہ جنگ ایک خاص طبقہ کے لوگوں کا پیشہ بن گئی تھی۔ اس لئے فوج میں اسی طبقہ کے لوگوں کی بھرتی ہوتی تھی اور آبادی کے بڑے حصہ کو سپہ گری کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عوام بھی سیاسی انقلابات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور ان کی دلچسپی کے اس فقدان نے ہندوستان کی سوسائٹی کی بنیاد ہلا دی۔ راجپوتوں میں سپہ گری اور جوانمردی تھی (جس کی مثال ہمیں کئی جنگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جس میں ترکوں کو عارضی طور پر شکست کا سامنا کرنا پڑا۔) لیکن ان میں باہمی اتحاد اور تعاون نہ تھا۔ وہ اپنے غرور اور تعصب کی بنا پر کسی کو مشترکہ لیڈر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور اہم مواقع پر جب یکجہتی اور یگانگت کی ضرورت ہوتی تو بھی وہ علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں بٹے رہتے اس لئے وہ اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے سے قاصر ہو جاتے جب کہ ترک پہاڑی علاقوں کے سرد مقامات کے رہنے والے تھے اس لئے میدان جنگ میں زیادہ محنت اور سرگرمی دکھا سکتے تھے ان میں تنظیم تھی اور وہ قواعد و آئین کے پابند تھے۔ ایک لیڈر کی اطاعت کر کے اپنی یکجہتی کا ثبوت دیتے تھے اور فوجی سرداروں کی اطاعت کی اہمیت کو سمجھتے تھے لیکن اس کے برخلاف ہندوستانیوں کو اپنی ذات اور فرقے کا ہی زیادہ خیال رہتا تھا۔ ان کے سامنے اتحاد مقصد نہ تھا۔ ان میں وہ لگن بھی نہ تھی جو کسی مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتی ہے اسی لئے اپنی جانبازی اور قربانی میں وہ اس جوش و خروش کا اظہار نہ کر سکے جس کی ضرورت تھی۔ ان کا طریقہ جنگ بھی فرسودہ تھا وہ ہاتھیوں پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ایران اور ترکستان کے تربیت یافتہ سوار اپنی چستی اور چالاکی سے نمایاں رہتے۔ پھر ترکوں کو فوج کی بھرتی میں بھی کبھی کسی دشواری

کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مال غنیمت حاصل کرنے اور اسلام کی اشاعت و شہادت کا شوق کچھ ایسا تھا کہ لشکری جوق در جوق فوج میں شریک ہوتے اور جب یہ اپنے گھوڑوں پر بے مثال پامردی اور سبک روی کا ثبوت دیتے تو ہندوستانی فوجی اپنے ہاتھیوں کے جھنڈ کے ساتھ اپنی جنگی قطار کی محافظت میں کھڑے رہتے اور مدافعانہ جنگ لڑتے۔

اسکے علاوہ خالص فوجی نقطہ نظر سے ہندوستانی فوجیں ایشیائی فن حرب کی جدید ترین ترقیوں سے پوری طرح واقف نہ تھیں۔ اس کے علاوہ جاگیردارانہ فوجی دستے جن پر بارہویں صدی کی ہندوستانی فوج مشتمل تھی بڑی ہندوستانی فوجوں کو مختلف العناصر نوعیت کا بنا دیتے تھے اور ان کے جذبہ وفاداری کو منتشر کر دیتے تھے۔ اور ان اصولوں میں بھی بنیادی فرق تھا۔ جس کے مطابق ہندوستانی اور ترکی فوجیں منظم کی جاتی تھیں اور میدان جنگ میں لڑتی تھیں۔

حرکت پذیری (mobility) ____ اس وقت کی ترکی فوجی تنظیم کا بنیادی عنصر تھا۔ یہ گھوڑوں کی اہمیت کا زمانہ تھا۔ اور تیزی سے نقل و حرکت کرنے والے مسلح گھوڑ سوار فوج اس وقت کا تقاضا تھا۔ جب کہ ہندوستانی فوج حکمت عمل (جسامت اور وزن کو حرکت پذیری پر ترجیح دیتی تھی۔ راجپوت تیز نقل و حرکت کے ساتھ حملہ کرنے کے بجائے دشمن کو کچل ڈالنا بہتر سمجھتے تھے۔ کثیر التعداد اور غیر منضبط صفیں جن کے آگے آگے بھڑکیلے ساز و سامان سے سجے ہاتھی ہوتے تھے جب کہ ایک تیز گھوڑ سوار فوج (جو گھوم کر دشمنوں کے داہنے بائیں جانب یا عقب سے حملہ کر سکتی تھی) کے مدمقابل ہوتے تو ان کی قطعی شکست لازمی تھی۔

تیز نقل و حرکت کا ہندوستانی فوج میں مکمل فقدان تھا۔ سر جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں۔

ان سرحد پار کے حملہ آوروں کے اسلحے اور گھوڑے انہیں ہندوستانیوں پر فیصلہ کن فوقیت دیتے تھے ان کے ساز و سامان بھی تیز اور تو پرلائے جاتے تھے۔ جن کو چارہ کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑتی۔ جو راستے میں ملنے والے درختوں کے پتوں اور جڑوں پر گزارہ کر لیتے تھے اس کے برخلاف بنجاروں کے زیر انتظام بیلوں پر لدا ہوا ہندوستانیوں کا لشکر سست رفتار اور تکلیف دہ تھا۔ حرکت پزیری کے بعد جیسا کہ آر۔ سی اسمتھ نے بتایا ہے کہ ترکوں کے فن جنگ کی دوسری خصوصیت ان کی تیر اندازی تھی اور یہ ایسا ہتھیار تھا جس کے ذریعہ دوری سے دشمن پر حملہ کیا جا سکتا تھا وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اور حرکت کرتے ہوئے تیر چلاتے تھے۔ یہ بات بھی ان کو سست رفتار اچھوت فوجوں پر مزید فوقیت دیتی تھی۔

ان حملوں کو بعض مورخوں کی "تنگ نظری اور غلط ترجمانی کی وجہ سے مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے حالانکہ محمود غزنوی کے حملوں کو دراصل یہ حملے بھی دولت اکٹھی کرنے اور غزنی کو سجانے کے لئے تھے۔

پروفیسر حبیب نے محمود کی فتوحات کے سلسلہ میں صاف کہا ہے کہ محمود کے حملوں کا مقصد اسلام کی تبلیغ ہرگز نہیں تھا۔

جہاں تک مندروں کو توڑنے اور دولت اکٹھی کرنے کا سوال ہے یہ کام شریعت کے خلاف ہے۔ اس زمانے میں لوٹ مار عام تھی۔ اسمتھ کا بیان ہے کہ یہی کام سمدر گپت نے دکن کی ریاستوں کو فتح کرنے کے بعد کیا تھا۔ البیرونی نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ محمود غزنوی کے حملوں سے

ہندوستان میں نہایت ناخوش گوار فضا پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔

اگر دیکھا جائے تو محمود غزنوی کا رویہ ہندوؤں کے ساتھ دوران فتح اور بعد میں بھی بہت اچھا رہا۔ نیل کنٹھ شاستری کا بیان ہے کہ محمود کی زندگی کا عام رویہ سیکولر تھا۔ وہ پہلا حکمران تھا جس نے افغانستان میں ایک سیکولر حکومت قائم کی تھی۔ محمود غزنوی نے ہندوستانیوں کی ایک فوج بھی تیار کی تھی۔ تلک نام کا ایک ہندو اس فوج کا سپہ سالار تھا۔

محمود نے اپنی اس زبردست کامیابی کے باوجود صرف دولت حاصل کی کسی کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا۔

اسی طرح ترکوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور ان کے کارنامے ہندوستانی تاریخ اور کلچر کا حصہ بن گئے۔

غزل

ایم۔ اے۔ شمسی دوگھروی
دیگھیار، سیلاس گنج، دربھنگہ۔ [illegible]

میری پرواز تخیل کی نہیں ہے کوئی حد — تم تو میری عظمتوں سے ہو ابھی تک نابلد
روح کی گہرائیوں سے رنگ بھرتا ہوں جہاں — شاعری میری ہے گویا فکر کی جد و جہد
کیا بدل سکتے ہیں وہ دل کے ارادوں کو مرے — ڈھا رہے ہیں کیوں ستم وہ بیشمار و بے عدد
پھر کوئی مظلوم لٹکایا گیا ہے دار پر — ہر طرف سے آ رہی ہے پھر صدائے المدد
میں تو اپنی کاوشوں کا بھی صلہ پایا نہیں — شہرتوں پہ کیوں مرے احباب کرتے ہیں حسد
میرا ہر فرمان گویا ایک پتھر کی لکیر — کون ہے شمسی جہاں میں میرے جیسا مستند

دوسری قسط

اندلس میں عربی زبان وادب کا ارتقاء

ڈاکٹر
محمد احمد فلاحی
شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علم لغت کی ترقی میں اہل اندلس نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اندلس نے ماہرین لغت پیدا کئے جنہوں نے اس میدان میں بڑا قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے علم لغت کے مشہور اشخاص میں ابوبکر الزبیدی متوفی ۳۷۹ھ کی "مختصر العین" علم لغت پر بہت اہم کتاب ہے ان کا پورا نام محمد بن الحسن الزبیدی ہے۔ عبدالمنعم خفاجہ نے اپنی کتاب میں انکے متعلق ابن الفرضی کے قول کا حوالہ دیا ہے کہ "كان واحد عصره في علم النحو وحفظ اللغة اخذ العربية عن ابي القالي وابي عبد الله الرياضي. وادب ولد المستنصر بالله ولي عهده وهشام وولي قضاء قرطبة وصنف "مختصر العين" و"ابنية سيبويه" و"الواضح في العربية" و"مايلحن فيه عوام الاندلس" و"طبقات النحويين" اس اقتباس سے ابوبکر الزبیدی کی مختصر سوانح حیات اور علم لغت میں ان کی خدمات واضح ہوتی ہیں علم لغت میں ان کی مہارت کا یہ بین ثبوت ہے کہ ولی عہد ہشام کے معلم ومربی رہ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حکم جیسا علم وادب میں گہری بصیرت رکھنے والا اپنے بیٹے کے لئے مربی کے انتخاب میں زبیدی سے بڑھ کر کسی اور کو اس کے لائق نہیں پا رہا ہوگا۔ مورخین نے دوسرا نام ابن سیدہ کا لکھا ہے ان کا پورا نام الحافظ ابوالحسن علی بن اسمٰعیل ہے۔

ان کی کتاب "کتاب المحكم في اللغة" جامع ہے۔ اس کی ترتیب "کتاب العین" کے طور پر ہے ان کی کتاب کا ایک نسخہ برطانوی مخطوطات کے کتب خانہ میں ہے ابن سیدہ ہی کی ایک کتاب "المخصص" ہے یہ ایک معجم ہے سترہ جلدوں میں مصر سے طبع ہو چکی ہے۔ ایک کتاب "شرح مشكل المتنبي" ہے جو مصری کتب خانہ میں مخطوط کی شکل میں ہے۔

ابن سیدہ کے والد بھی علم لغت میں حاذق تھے اپنے والد ہی کے نقش قدم پر چل کر اور ان سے استفادہ کرکے ابن سیدہ بھی علم لغت کے جید علماء میں شمار ہونے لگے ابن سیدہ کا انتقال ۴۵۸ھ میں ہوا۔

ادب ولغت کے ماہرین میں عبد الله بن السيد البطليوسي کا بھی شمار ہوتا ہے انہوں نے بلنسیہ میں اپنی زندگی گزاری۔ وہیں درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔ دور دراز سے لوگ ان سے استفادہ کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ ان کی ایک کتاب "الاقتضاب في شرح ادب الكاتب" کا تذکرہ ملتا ہے ان کی وفات ۵۲۱ھ میں ہوئی "الحدائق في الاصول الدينية" کا ایک نسخہ برلن کے مکتبہ میں ہے "الانصاف في الاسباب التي اوجبت الاختلافات بين المسلمين في آرائهم" مصر سے ۱۲۹ صفحات میں شائع ہو چکی ہے۔ "التنبيه على الاسباب الوجيدة للخلاف بين المسلمين" کے نام سے۔

لغت کے ماہرین میں ابو علی القالی کی بھی زبردست خدمات ہیں انہوں نے بغداد اور عراق سے تعلیم حاصل کی۔ اپنی زندگی کا چوتھائی حصہ بغداد میں تعلیم وتعلم میں گذارا۔ پھر ۳۳۰ھ میں اندلس آئے یہاں آپ کی پذیرائی ہوئی۔ عبدالرحمٰن ناصر نے حکم کی تعلیم وتربیت کے لئے رکھا۔ ان کے معاصرین

نے ان سے بہت کسب فیض کیا۔ مسجد قرطبہ میں انہوں نے تدریسی خدمات انجام دیں۔"کتاب الامالی" کی ترتیب کا کام وہیں انجام پایا۔

ان کا نام اسمٰعیل اور کنیت ابو علی تھی۔ باپ کا نام قاسم تھا۔ لغت اور شعر پر زبردست گرفت تھی۔ نحو میں بصری مسلک کا رجحان تھا ان کے اساتذہ میں ابن درید نفطویہ ابن درستویہ وغیرہم ہیں۔ ان کی تصنیف "کتاب الامالی" کی وجہ سے انہیں شہرت ملی یہ کتاب قدیم عربی ادب کے مستند مصادر میں شمار کی جاتی ہے اس کتاب کے مقدمہ میں ابو علی خود لکھتے ہیں۔

اودعته فنونا من الاخبار وضروبا من الاشعار وانواعا من الامثال وغرائب من اللغات على انى لم اذكر فيه بابا من اللغة الا اشبعته ولا ضربا من الشعر الا اخترت اجوده ولا فنا من الخبر الا انتخلته ولا نوعا من المعانى والمثل الا استجدته ثم لم اخله من غريب القرآن وحديث الرسول على انى اوردت فيه الابدال مالم يورده احد وفسرت فيه الاتباع مالم يفسره بشر

یعنی اس کتاب میں میں نے اخبار، اشعار، امثال، لغات وغیرہ خوب چھان پھٹک کر آراستہ کئے ہیں۔ ساتھ ہی قرآن وحدیث کے جواہر پارے اس کتاب کی زینت کا سبب ہیں اس طرح کی کوشش اس سے پہلے نہیں کی گئی۔

کتاب الامالی کی حیثیت ایک قدیم مصدر اور مرجع کی ہے بعد کے ائمہ لغت وادب نے جو کچھ بھی علم لغت وادب کی خدمت کی ہے وہ اس کتاب کی مرہون منت ہے اور مستقبل میں بھی کوئی شخص اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کتاب میں لغت وادب کا اتنا ضخیم اور مستند سرمایہ

موجود ہے کہ اس کتاب کی افادیت سے انکار ممکن نہیں ہے ساتھ ہی محقق نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ جو شخص بھی علم لغت وادب میں تحقیق اور تزئین و آرائش اور تہذیب و تنقیح چاہتا ہو اس کے لئے اس کتاب سے استفادہ از حد ضروری ہے۔

ابو علی قالی اور ان کی مشہور تصنیف سے متعلق مورخین نے توصیفی کلمات کہے ہیں مثلاً صاحب معجم الادباء نے لکھا ہے "کتاب الامالی معروف بين الناس كثير الفوائد غاية في معناه"۔ اور الزبیدی کے بقول "ما نعلم احداً من المتقدمين الف مثله۔" ان کی بے شمار کتب میں سے "الامالی" کے علاوہ "المقصور والممدود" و "کتاب الابل" و "کتاب حلى الانسان" و "الخيل وشياتها اور کتاب" فعلت وافعلت "مقاتل الفرسان" "تفسير سبع الطوال" "کتاب البارع" "فی اللغۃ" وغیرہ ہیں۔ "الامالی" مصر سے متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

ابو علی کے معاصرین میں ابن القوطیہ ہیں ان کا زمانہ ۲۸۸ھ سے ۳۵۶ھ کا ہے۔ منصور ابن عامر نے اپنے دور اقتدار میں یہ چاہا تھا کہ کتاب الامالی کا بدل اور ثانی پیش کیا جائے تاکہ اس کی شہرت میں مزید اضافہ ہو اس کیلئے اس نے ابو العلاء صاعد لغوی جو مشرق سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ کی خدمات حاصل کیں اور ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس کتاب کا ثانی بلکہ نعم البدل پیش کریں۔ صاعد نے نہایت کوشش کر کے "کتاب الفصوص" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی جو اس کے معاصر علماء، ادباء اور شعراء کے بقول بالکل لغو اور لایعنی کتاب تھی۔ لہٰذا اسی وقت دریا برد کر دیا گیا۔ اس واقعہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی مہارت سے ابو علی قالی نے اس کتاب کی تالیف میں کام لیا تھا۔

ابو علی قالی کے اساتذہ میں قاضی یوسف بن یعقوب البصری (م ۳۲۹ھ)

۳۰۹ھ) ابو القاسم عبد اللہ بن محمد البغوی البغدادی (۲۱۳ھ۔ ۳۱۷ھ) الحسین بن اسمٰعیل المحاملی البغدادی (۲۳۵ھ، ۳۳۰ھ) کے نام قابل ذکر ہیں۔

لغت نحو اور ادب کے اساتذہ میں ابو اسحٰق ابراہیم بن السری الزجاج (۲۴۱۔ ۳۱۱ھ) ابو الحسن علی بن سلیمان المعروف بالاخفش الاصغر متوفی ۳۱۵ھ ابوبکر محمد بن السری بن السراج متوفی ۳۱۶ھ ابوبکر محمد بن الحسن بن زید (۲۲۳-۳۲۱ھ) احمد بن عبد اللہ بن مسلم بن قتیبہ الدینوری متوفی ۳۲۲ھ معروف ہیں۔

اندلس میں ترقی کی بنیاد ڈالنے والے اور علوم و فنون کی بنیاد قائم کرنے والے اصل محرک اہل مشرق تھے۔ گویا علوم و فنون کا مصدر و منبع اور سر چشمہ مشرق تھا۔ وہیں کے چشمہ صافی کے سوتے پھوٹ کر دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے تھے لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ اہل اندلس بڑی حساس طبیعت و مزاج کے حامل تھے۔ مشرق سے اخذ کردہ علوم و معارف میں جدت، ابتکار اور تنوع پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے تھے خاص طور سے یہ ذوق و شوق جنون کی حد تک اس وقت بڑھ گیا جب کہ مشرق سے اُمویوں کا خاتمہ ہونے کے بعد عباسی زیر اقتدار آئے۔ مشرق سے ہٹ کر جب امویوں کی حکومت اندلس میں قائم ہو گئی اور اندلس مشرقیوں کے اقتدار سے آزاد ہو کر ایک مستقل سلطنت کی حیثیت سے جانا جانے لگا تو اس وقت ملوک، خلفاء، امراء حتیٰ کے عوام کے اندر بھی جذبہ مسابقہ و مقابلہ اپنی انتہا کو پہنچا لیکن ظاہر ہے ایک نئی حکومت جس کے ابھی ابھی بال و پر نکلے ہیں وہ کسی کو اپنا راہ نما ضرور بنائے گی۔ اندلس کی اموی حکومت کے اندر یہ جذبۂ مقابلہ زیادہ تھا کیونکہ انہیں اس بات کی فکر تھی کہ اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اقتدار پر گرفت مضبوط کی جائے اور اس کا بہترین

طریقہ یہ تھا کہ ملک کو ہر لحاظ سے اس قابل بنا دیا جائے کہ ترقی کی اس دوڑ میں ترقی یافتہ مشرق کے بالمقابل کھڑا ہو سکے۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ہر ممکن تدبیر کر ڈالیں۔ اس کے لئے انہوں نے جہاں ملکی نظام و انتظام و فلاحی استحکام رعایا کی خوشحالی اور فارغ البالی کی طرف توجہ دی۔ وہیں اندرونی و بیرونی فتنوں سازشوں اور بغاوتوں کو دبانے کے ساتھ ساتھ علوم و معارف اور فنون کی ترقی کے لئے مؤثر اقدامات کئے۔ علوم و معارف کو فروغ دینے کے لئے ضروری تھا کہ ملک میں ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ عوام ان کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھا سکیں۔ اموی سلاطین کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ تقریباً سبھی بہترین عالم ادیب اور شاعر تھے۔ چنانچہ مدارس، جامعات اور پبلک لائبریریوں کا جال پورے اندلس میں بچھا دیا۔ ملک سے چیدہ چیدہ اشخاص کو مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے مشرق روانہ کیا گیا۔ کچھ ایسے تھے جو از خود طلب علم کے شوق میں دور دراز کا مشقت طلب سفر کرتے تھے سلاطین کا یہ عالم تھا کہ باقاعدہ ایک کمیٹی مقرر تھی کہ کہیں بھی کوئی کتاب تصنیف ہو وہ اندلس کی لائبریری میں لائی جائے اس طرح مترجمین کی ایک بہت بڑی تعداد موجود تھی جو ہمہ وقت دوسری زبانوں کی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام انجام دیتی تھی۔ ڈاکٹر احسان عباس نے اپنی کتاب میں اندلسیوں کے اہل مشرق سے مقابلہ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

اہل اندلس نے مشرقیوں سے اخذ کردہ علوم میں مختلف حیثیتوں سے اضافہ کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کیا علوم و فنون میں تنوع، جدت اور بعض دفعہ تو اس کا بالمقابل بلکہ اس سے بڑھ کر تخلیق پیش کی۔

اندلس سے مشرق کی طرف کسب علم کی خاطر جانے والوں میں علماء فضلاء

ادبار، شعراء، نحویین، مورخین، مفسرین، محدثین اور فقہاء ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے تھے ——— مقری نے اپنی کتاب میں تین سو سے زائد ایسے اشخاص کے نام پیش کئے ہیں جو تحصیل علوم کی خاطر مشرق گئے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جنہوں نے مستقل طور سے مشرق ہی کو اپنا مستقر بنایا لیکن ان میں بیشتر ایسے تھے جو اندلس واپس آئے اور انہوں نے اپنے ملک اور عوام کے لئے خدمات انجام دیں۔ چاہے وہ درس و تدریس کی صورت میں ہو یا تصنیف و تالیف کی صورت میں۔ ابن الفرضی نے اپنی کتاب میں ان اشخاص کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے جو مشرق استفادہ کی غرض سے گئے۔

۱ ——— علماء میں یحیٰ بن یحیٰ اللیثی نے مشرق کا سفر کیا اور امام مالک کے درس میں شریک ہو کر ان سے استفادہ کیا۔ اندلس میں آکر موطاء امام مالک کی روایت آپ ہی نے کی اور آپ ہی کی وجہ سے اندلس میں مالکی مذہب کو فروغ حاصل ہوا۔ فقہ پر ان کی گراں قدر تدریسی اور تالیفی خدمات ہیں جن کا ذکر مورخین نے کیا ہے۔

۲ ——— قاضی ابو عبد اللہ محمد بن ابو عیسیٰ متوفی سنہ ۳۳۹ھ یہ یحیٰ بن یحیٰ اللیثی کے پوتے تھے۔ یہ بھی مشرق کسب علم کی خاطر گئے اور وہاں سے واپسی کے بعد قرطبہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ یہ حق گو، حق پرست اور بے باک قاضی تھے ان کے اساتذہ میں ابن منذر عقیلی اور ابن الاعرابی وغیرہم ہیں۔ یہ شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے۔

۳ ——— منذر بن سعید البلوطی۔ یہ مشرق حج کی غرض سے گئے تھے۔ وہاں محمد بن المنذر النیشاپوری سے سماع کیا۔ ابتداء میں عبد اللہ بن یحیٰ بن یحیٰ سے کسب فیض کیا۔ مشرق سے واپسی کے بعد سنہ ۳۳۹ھ

میں قاضی قرطبہ ہوئے اور حکم ثانی کے عہد خلافت میں سنہ ۳۵۵ھ میں وفات پائی۔

۴ ——— ابو بکر ابن العربی۔ آپ سنہ ۴۸۵ھ میں مشرق گئے۔ شام، عراق اور بغداد کا سفر کیا اور وہاں کے کبار اہل علم سے استفادہ کیا۔ اور مصر و اسکندریہ ہوتے ہوئے اندلس سنہ ۴۹۳ھ میں واپس آئے۔ فضل و کمال میں یکتائے روزگار تھے۔ یہ اشبیلیہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ ان کی پیدائش سنہ ۴۶۹ھ میں ہوئی اور انتقال سنہ ۵۴۳ھ میں ہوا۔ ان کی متعدد تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ "القبس فی شرح موطا مالک ابن انس" (۲) ترتیب المسالک فی شرح موطا مالک (۳) انوار الفجر (۴) احکام القرآن (۵) عارضۃ الاحوذی فی شرح الترمذی (۶) سراج المریدین (۷) المشکلین مشکل القرآن والسنۃ (۸) الناسخ والمنسوخ فی القرآن"

ان کی ان مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ اور دیگر تصانیف ہیں جن کے اسماء مقری نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں۔ ابو بکر ابن العربی کے متعلق صاحب تحفۃ الادب ابن خاقان کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ۔

ابو بکر ابن العربی علوم و معارف کا ایک بحر زخار اپنے قلب و ذہن میں سموئے ہوئے تھے جن کی ذہانت و فطانت اور علوم و فنون میں بالادستی نے اگلوں کو کافی پیچھے ڈھکیل دیا تھا اور اندلس اور اہل اندلس کی خدمت اس وسیع پیمانے پر کی کہ اہل اندلس بحر زخار سے خوب سیراب ہوئے ان کے والد بھی علوم و فنون میں اشبیلیہ کے بدر کامل اور یکتائے روزگار تھے۔

۵ ——— ابو الولید الباجی۔ یہ فقیہ، متکلم، ادیب اور شاعر تھے۔ طلب علم کی غرض سے عراق، بغداد اور دمشق گئے اور وہاں کے اہل علم سے استفادہ کیا۔ ان کی کچھ تصانیف مشہور ہیں جن میں مختصر

المختصر" "الاشارۃ فی اصول الفقہ" "الحدود" "اختلاف الموطا" اور "سنن الصالحین" ہیں۔ ان کی پیدائش سنہ ۳۱۰ھ اور وفات سنہ ۳۷۳ھ میں ہوئی۔

۶ ـــــــ ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم ۔ انہوں نے مصر میں ابوالفرج صوفی سے کسب علم کیا اور ابومحمد بن نحاس، ابوالقاسم طحان وغیرہم سے علم حدیث سیکھا۔ یہ عالم، ادیب، شاعر اور لغوی تھے۔ انکی بیشتر تصانیف علم قرآن و حدیث پر ہیں۔ مقری نے تصانیف کی تفصیلات نہیں لکھی ہیں۔ وفات سنہ ۴۵۵ھ میں ہوئی۔

۷ ـــــــ اس طرح ابوعبداللہ محمد ابن قاسم بن محمد بن محمد خیرون متوفی سنہ ۳۰۶ھ مشرق استفادہ کی غرض سے گئے۔ ان کی دیگر تفصیلات کا ذکر نہیں ملتا۔

۸ ـــــــ ابومحمد علی بن احمد بن سعید حزم بن غالب بن صالح ابن حزم کے نام سے مشہور ہوئے۔ پہلے شافعی المسلک تھے۔ بعد میں ظاہری المسلک ہو گئے۔ ادب، فلسفہ، منطق اور علوم اسلامیہ میں ان کی متعدد تصانیف ہیں جن میں "الفصل بین اہل الاہواء و النحل" "الصادع والرادع علی من کفر اہل التاویل من فرق المسلمین والرد علی فرق التقلید" وغیرہ مشہور ہیں ان کی وفات سنہ ۴۵۶ھ میں ہوئی۔

۹ ـــــــ ابوبکر محمد بن الولید بن محمد بن خلف۔ الطرطوشی کے نام سے مشہور ہوئے۔ مشرق سے انہوں نے بھی استفادہ کیا ہے ان کی بھی بے شمار تصانیف ہیں جن کا ذکر مقری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

۱۰ ـــــــ خلف ابن القاسم بن سہل بن دباغ الاندلس۔ علم حدیث میں خاص مہارت مصر میں جا کر حاصل کی۔ اور اندلس واپس آکر

اہل وطن کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔ ان کی وفات سنہ ۳۹۳ھ میں ہوئی۔

۱۱ ـــــــ ابوعبداللہ محمد بن فتوح بن عبداللہ الازدی الحمیدی (۴۲۰ھ - ۴۸۸ھ)

طلب علم و ادب کی خاطر مشرق گئے پھر وہاں سے اندلس واپس آکر انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی تصانیف میں "جذوۃ المقتبس فی اخبار علماء الاندلس" "الذہب المسبوک فی وعظ الملوک" "تسہیل السبیل الی علم الترسیل" "تاریخ الاسلام" "من ادعی الامان من اہل الایمان" "النعمۃ" "الامانی الصادقۃ" ان کی سب سے مشہور کتاب "الجمع بین الصحیحین" ہے "جذوۃ المقتبس" انہوں نے بغداد میں تالیف کی تھی۔

۱۲ ـــــــ ابن عبد ربہ ۔ کسب علم کی خاطر مشرق گئے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب جو اپنے موضوع پر بے نظیر ہے وہ "العقد الفرید" ہے۔

۱۳ ـــــــ ابوالولید و ابومحمد عبداللہ بن محمد بن یوسف بن نصر الازدی القرطبی ـــــــ یہ ابن الفرضی کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ سنہ ۳۸۲ھ میں مشرق گئے اور کئی علماء سے مستفید ہوئے وہاں سے واپسی کے بعد بلنسیہ کے قاضی بھی رہے محمد المہدی کے زمانہ اقتدار میں۔ علم حدیث، فقہ، رجال اور ادب وغیرہ علوم پر کمال حاصل تھا۔ ان کی متعدد تصانیف کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے جن میں "تاریخ علماء الاندلس" "المؤتلف والمختلف" "اخبار شعراء الاندلس" وغیرہ بہت مشہور ہیں ان کی پیدائش سنہ ۳۵۱ھ اور وفات سنہ ۴۰۳ھ میں ہوئی۔ ایک بربر کے ہاتھوں قرطبہ میں قتل کئے گئے۔

۱۴ ——— ابو محمد عبد العزیز بن احمد بن السید بن المغلس القیسی الاندلسی البلنسی (متوفی ۴۲۹ھ اور بہ اختلاف روایت ۴۲۷ھ)

عربی زبان و ادب کے ممتاز عالم تھے۔ اندلس سے ہجرت کر کے مصر گئے اور وہیں مستقل طور سے اقامت اختیار کرلی۔ صاعد اللغوی صاحب "کتاب الفصوص" سے علم لغت شعر و ادب سیکھا۔ علم کی طلب میں بغداد بھی گئے اور وہاں کے علماء و ادباء سے کسب فیض کیا۔ شعر و ادب میں کمال حاصل تھا ان کی تصانیف کا ذکر نہیں ملتا۔

۱۵ ——— ابو عمرو عثمان بن سعید بن عثمان بن عمرو (سنہ ۳۷۱-۴۴۴ھ)

۳۹۷ھ میں مصر گئے اور وہاں کے علماء سے مستفید ہوئے مقری نے ان کی ۱۲۰ تصانیف بتائی ہیں جو زمانہ کی نذر ہوگئیں۔ ابن بشکوال کے بقول "کان ابو عمرو احد الائمۃ فی علم القرآن ورواياتہ وتفسیرہ ومعانیہ وطرقہ واعرابہ وجمع فی ذالک کلہ توالیف حسانا۔"

۱۶ ——— الیسع بن عیسی بن حزم بن عبد اللہ الغافقی

اصلاً بلنسیہ کے تھے۔ مالقہ اور المریۃ میں بھی رہے۔ ان کی کنیت ابو یحیٰی تھی۔ یہ مصر ۵۶۰ھ میں آ گئے تھے اور وہیں مستقل طور سے سکونت اختیار کرلی۔ مقری نے ان کی تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں "المغرب فی محاسن اهل المغرب" بھی ہے۔ یہ تالیف مصر ہی کے زمانہ قیام کی ہے۔ ان کی وفات ۵۷۵ھ میں ہوئی۔

۱۷ ——— محمد بن عبد الرحمان بن علی بن محمد المذحجی

کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ اشبیلیہ سے تعلق تھا۔ ابتداء میں اندلس میں گھوم گھوم کر علم حاصل کیا پھر حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور اپنی زندگی کے آخری ایام

بقیہ ص ۹۰ پر

پروفیسر خورشید احمد

دوسری قسط

نظام تعلیم

برطانوی استعماری عہد

تعلیمی رجحانات اور نیا نظام تعلیم

ہندوستان میں انگریز پہلے پہل معاہدوں اور تاجروں کے روپ میں آئے اور بالآخر اس ملک کے حکمران بن گئے "ایسٹ انڈیا کمپنی" ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء میں قائم ہوئی۔ اس کمپنی کا مقصد تجارت تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی ایک سیاسی حیثیت بھی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا سیاسی پہلو زیادہ حاوی ہوتا گیا اور ۱۷۵۷ء کی "جنگ پلاسی" میں فتح کے بعد یہ ایک سرکاری فرمان کے ذریعے انگریزوں کے حوالے کر دی گئی۔ یہاں سے انگریزوں کی تعلیمی اور سیاسی حکمت عملی کا آغاز ہوتا ہے۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کا راج ۱۸۵۷ء تک رہا، جب کہ ملکہ وکٹوریہ نے پورے اختیارات براہ راست خود سنبھال لئے، اور پھر برطانوی حکومت ۱۹۴۷ء تک حکمران رہی۔

اس دور کا جائزہ لیا جائے تو سب سے پہلی بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ "کمپنی" کے بالواسطہ برطانوی دور اور برطانوی حکومت کے براہ راست راج کے درمیان تعلیمی نقطہ نظر سے کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ یہ ایک تسلسل ہے، جس میں کسی قسم کا انقطاع واقع نہیں ہوا۔ گو سیاسی انتظامی حیثیت سے ۱۸۵۷ء ایک اہم موڑ ہے۔ لیکن انگریزوں کی تعلیمی حکمت عملی کے نقطہ نظر سے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ اس لئے ہم پورے دور کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھیں گے۔ زیر نظر مضمون میں ہم نے جو ذیلی ادوار قائم کئے ہیں، وہ خالص تعلیمی نقطہ نظر سے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ تاج برطانیہ نے جو تعلیمی پالیسی وضع کی اس کی بنیادیں کمپنی کے دور میں پڑیں اور ان پر عمل بعد کے ادوار میں بھی ہوتا رہا۔ اس لیے اگر ہمیں اصل بنیادوں کا فہم پیدا کرنا ہے تو "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے دور کے فکری رجحانات کو بہ نظر غائر دیکھنا ہوگا۔

اس پورے دور کے جائزے سے چند اہم ادوار واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں اور وہ ہمارے خیال میں یہ ہو سکتے ہیں:

پہلا دور	۱۷۶۵ء سے ۱۸۱۳ء	دوسرا دور	۱۸۱۳ء سے ۱۸۵۴ء
تیسرا دور	۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۵ء	چوتھا دور	۱۹۰۵ء سے ۴۷ ۱۹ء

پہلا دور (۱۷۶۵ء - ۱۸۱۳ء)

سیاسی حیثیت سے یہ کشمکش، تصادم اور اہل ہند کی سیاسی مغلوبیت کا دور ہے۔ کمپنی کا راج آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا اور جہاں کہیں اسے فوجی اقتدار حاصل نہ تھا، وہاں بھی اس کا سیاسی اثر و نفوذ بڑھ رہا تھا۔ ان حالات میں فطری طور پر کمپنی کے حکام کو تعلیم کے بارے میں اپنی پالیسی طے کرنا پڑی۔

پندرھویں صدی میں جب انگلستان نے پارلیمنٹ کے ذریعے قائم ہونے والی کمپنیوں کی وساطت سے بین الاقوامی تجارت کا ایک عالمی جال پھیلایا، تب یورپ کے عیسائی پادریوں نے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ یہ ان کے لیے مشرق میں اثر و نفوذ کا نادر موقع ہے۔ اس مقصد کے لیے ایشیا و افریقہ کے تقریباً تمام اہم تہذیبی مراکز کی طرف عیسائی مبلغین بھیجے گئے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی مشنری تعلیمی ادارے تھے۔ "ایسٹ انڈیا کمپنی" سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عیسائی پادریوں کو تعلیم و تبلیغ کے مواقع فراہم کرے اور جہاں اس کی تجارتی کوٹھیاں (ENCLAVES) قائم ہوں، وہاں تعلیم کی ذمہ داریاں ان عیسائی مشنریوں کے سپرد کرے۔

نیز اپنے تجارتی جہازوں پر بھی ان کو کام کرنے کا پورا پورا موقع دے۔

ہندوستان میں اس پالیسی کے تحت، کمپنی کے قدم رکھنے کے فوراً بعد ۱۸۱۳ء میں مشنری مقاصد کے لیے تعلیم کا آغاز کیا گیا۔ تعلیم کا مورخ این۔ این۔ لا (N. N. LAW) لکھتا ہے "۱۸۱۳ء میں کمپنی کے وسائل سے اس مقصد کیلئے ضروری اقدامات کیے گئے کہ ہندوستانیوں کو بائبل کی تعلیم کے لیے تیار کیا جائے اور کمپنی ہی کے خرچ پر انتظام بھی کیا گیا کہ ان ہندوستانی عیسائی مشنریوں کو آگے تبلیغی کام کرنے کے لیے ضروری تربیت و تعلیم دی جا سکے۔" ۱۶۹۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے باقاعدہ ایک "دفعہ تبلیغ" (MISSIONARY CLAUSE) منظور کی، جس کے ذریعے لازم کیا گیا کہ کمپنی کے ہر جہاز، ہر فیکٹری اور ہر مرکز پر عیسائی مبلغین کا بندوبست کیا جائے اور نوآبادیات (COLONIES) کے شہریوں کے لیے عیسائی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

جیسے جیسے کمپنی کا اقتدار بڑھتا گیا، عیسائی مبلغین کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں اور خصوصیت سے ان کے نئے نئے تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ یہ اسکول نہ صرف عیسائیوں اور نوآبادکاروں کے لیے کھولے گئے، بلکہ غیر عیسائیوں اور ہندوستان کے عام باشندوں کے لیے بھی قائم کیے گئے۔ لیکن جوں جوں یہ سلسلہ بڑھا، اہل ہند اور خصوصیت سے مسلمان اس کو تشویش کی نگاہ سے دیکھنے لگے، اور بالآخر مسلمانوں نے اس کے خلاف پوری قوت سے آواز اٹھائی، جبکہ ہندوؤں نے بالعموم ان اداروں سے فائدہ اٹھایا۔ اٹھارویں صدی کے اختتام تک اس احتجاجی ردعمل کا اثر یہ ہوا کہ کمپنی کے حکام کو سیاسی مصالح کی بنا پر اپنی پالیسی میں ایک گونہ نرمی پیدا کرنی پڑی۔

کمپنی کے اس دور کی تعلیمی پالیسی کو ہم درج ذیل نکات میں سمیٹ سکتے ہیں:

۱۔ بالواسطہ اور جہاں ممکن ہو، بلاواسطہ طور پر مشنری اداروں کی مدد اور سرپرستی۔ بالعموم یہ کام کھلم کھلا ہوا، لیکن جن مقامات پر زیادہ مخالفت

ہوئی، وہاں صرف مالی مدد اور دوسری سہولتیں فراہم کی گئیں۔

۲۔ کمپنی کے وہ حکام جو زیادہ بالغ نظر اور فہیم تھے، وہ مغربی تعلیم تو ضرور دینا چاہتے تھے لیکن ان کا اصرار تھا کہ یہ تعلیم مشرقی علوم کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیے اور مشرقی علوم میں بھی بنیادی اہمیت فکر و فن کو نہیں، بلکہ زبان و ادب کو دی جانی چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اولین اہمیت سنسکرت اور ثانوی اہمیت عربی اور فارسی کو دی جائے۔ مدرسوں اور پاٹھ شالوں کو قائم رہنے دیا جائے اور اعلیٰ مذہبی تعلیمی اداروں کو مالی مدد بھی دی جائے اور پنڈتوں اور مولویوں کو مختلف قسم کے انعامات و خطابات سے نوازا جائے۔ یہ وہ گروہ ہے جسے مغربی مستشرقین (ORIENTALISTS) کا مکتب فکر کہا جاتا ہے انہی کے زیر اثر ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج اور بنارس کا سنسکرت کالج قائم ہوئے۔ نیز سنسکرت پر تحقیقات کا آغاز ہوا۔ پرانی کتابیں شائع کی گئیں یہ اور بات ہے کہ سارے وسائل ہندو لٹریچر کی اشاعت پر صرف ہوئے اور مسلمانوں کی ایک بھی قابل ذکر چیز شائع نہ کی گئی۔

۳۔ ایسے نئے ادارے قائم کیے گئے، جو کمپنی کی ضرورتیں پوری کر سکتے اور ان سے ایسے منتظمین تیار کیے جا سکیں، جو نئے سیاسی نظام کیلئے مفید آلۂ کار ثابت ہوں۔

یہ وہ عام تعلیمی مقاصد تھے، جو "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے پہلے دور میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس دور کے جائزے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ کمپنی کے حکام کسی ایک سمت گیر پالیسی پر یکسو نہ تھے۔ وہ مقامی نظام سے تصادم مول لیے بغیر مغربی تعلیم اور خصوصاً مشنری تعلیم کی سرپرستی کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں اپنے نظام تعلیم و تمدن کو رواج دینا چاہتے تھے۔ غالباً سیاسی مصالح انہیں مجبور کرتے تھے کہ کھل کر یہاں کے نظام سے ٹکراؤ مول نہ لیں اور ایسی پالیسی

اختیار کریں، جس سے یہاں کا تعلیمی نظام سسک سسک کر اپنی موت آپ مر جائے اور ایک دوسرا نظام فطری رفتار کے ساتھ مکمل غلبہ و تسلط حاصل کرے اور انہیں یہاں کے نظام کو تشدد کے ساتھ مٹانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ گویا سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ لیکن دوسری طرف مغربی مؤرخین اس دور کو "تعلیمی غیر جانبداری" کا دور قرار دیتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ کمپنی نے تعلیم سے غفلت برتی۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اس دور کی پالیسی نہایت ہوشیاری و عیاری سے بنائی گئی تھی۔ آخری مقاصد اس کے وہی تھے، لیکن وہ اس کام کو تدریج اور تدبیر کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔

ہم اسی اس پالیسی کو SLOW POISONING POLICY کہہ سکتے ہیں

کمپنی کسی قدر سمجھداری مگر احتیاط کے ساتھ جس حکمت عملی پر کام کر رہی تھی، یورپ کے متشدد اور جنونی (FANATIC) پادری اس پر مطمئن نہ تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو چشم زدن میں عیسائیت کے رنگ میں رنگ دیں۔ اس لیے انہوں نے اس پالیسی کو عیسائیت سے غداری کے مترادف قرار دیا اور پارلیمنٹ کے اندر اور باہر اس کے خلاف شدید واویلا مچایا۔ ان کا کہنا تھا کہ تعلیم کے پورے اختیارات عیسائی مشنری اداروں کو دیے جانے چاہئیں، کمپنی کے وسائل ان کے ہاتھوں میں دیے جائیں اور مقامی زبانوں یا ہندوستان کی اقوام کے ادب و ثقافت پر کوئی توجہ نہ دی جائے۔

یہ کشمکش نہ صرف کمپنی کے حکام کے درمیان چلی تھی، بلکہ کمپنی کے عملے اور انگلستان کے دوسرے بااثر عناصر کے درمیان بھی نقطۂ عروج پر تھی۔ اور بالآخر یہ کشمکش ۱۸۱۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے "چارٹر ایکٹ" کی منظوری پر منتج ہوئی۔ یہ قانون ہندوستان کی تعلیمی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اس ایکٹ نے جو نئی بنیادیں طے کیں وہ یہ تھیں:

الف۔ تعلیم حکومت کی ذمہ داری ہوگی اور اسے اپنے وسائل اس مقصد کے

لئے مثبت طور پر صرف کرنا ہوں گے۔ چونکہ "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی حیثیت "ریاست در ریاست" کی ہے، اس لئے وہ اہل ہند کی تعلیم کی ذمہ دار ہوگی۔

ب۔ تعلیم کے لئے مالی بجٹ بنایا جائے گا اور باقاعدہ سالانہ میزانیہ (Budget) کے ذریعے فروغ تعلیم پر روپیہ صرف کیا جائے گا۔

ج۔ تعلیم کے لئے اولین مقصد اہل ہند تک عیسائیت کا پیغام پہنچانا ہوگا۔ اس کے لئے عیسائی مشنری اداروں کو نہ صرف کھلی اجازت دی جائے گی، بلکہ ہر ممکن سرپرستی کی جائے گی۔ اب تک کمپنی کی جو بظاہر گومگو کی پالیسی تھی اسے قانونی طور پر مشنری تعلیم کے حق میں طے کر دیا گیا۔

د۔ تعلیم میں انگریزی تعلیم اور انگریزی ذریعہ تعلیم کو اختیار کیا جائے گا۔

ھ۔ کچھ وسائل ہندوستانی (سنسکرت و عربی) لٹریچر کے فروغ نیز مقامی اہل علم کی حوصلہ افزائی کے لئے بھی استعمال کئے جائیں گے۔

مذکورہ بالا قانون ہندوستان میں انگریزی نظام تعلیم کے سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد جو بھی ارتقاء ہوا، اس کے دیئے ہوئے خطوط پر ہوا۔ لارڈ میکالے نے اپنے تمام تر قوی خبث باطن کے ساتھ تعلیم کے بارے میں جو کچھ کہا، اس نے آئندہ کی تعلیمی ترقیات کو بلاشبہ کافی حد تک متاثر کیا، لیکن ہم اس کو جدید تعلیمی نظام کا بانی ماننے کو تیار نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی فکری کوشش چارلس گرانٹ کی دستاویز ہے، جو ۱۸۱۳ء کے قانون کی بنیاد بنی۔ مسٹر گرانٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر تھا اور تین بار بورڈ آف ڈائریکٹرز کا صدر رہا۔ وہ برطانوی پارلیمنٹ کا ممبر بھی تھا اور یہ اسی کے افکار و نظریات ہیں، جن کا عکس ۱۸۱۳ء کے چارٹر میں نظر آتا ہے۔ اس کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستانی سوسائٹی نہایت پست اخلاقی حالت [illegible] سے دوچار ہے اور اس کا علاج عیسائی مذہب کے سوا کچھ نہیں۔ صرف ایک اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"ہمارا لائحہ عمل یہ ہوگا جسے ہم اس احساس کے ساتھ پیش کر رہے ہیں کہ یہ بات ہماری قوت و اختیار میں ہے کہ ہم اہل ہند کو بتدریج سب سے پہلے اپنی زبان سکھائیں اور پھر اس زبان کے ذریعے اپنے ادب کی آسان تخلیقات سے متعارف کرائیں، جو متنوع موضوعات پر موجود ہیں۔ ہماری اس بات پر بے صبری کے ساتھ ہمیں پرجبیں نہ ہوا جائے۔ آہستہ آہستہ ہم اس کے ذریعے اہل ہند کو اپنے فلسفۂ حیات اور بالآخر اپنے مذہب تک لے جائیں گے۔ ان تمام کا حصول آہستہ آہستہ اور پوری خاموشی کے ساتھ اہل ہند کے گندے اور فرسودہ نظام کو نیست و نابود کر دے گا۔"

یہ تھی وہ فکری بنیاد، جس پر نئی برطانوی تعلیمی پالیسی قائم ہوئی اور جسے لارڈ میکالے نے ترقی دے کر ایک فلسفہ اور ایک نظام بنا دیا۔

دوسرا دور (۱۸۱۳ء۔۱۸۵۴ء)

پہلے دور میں جو نئی بنیاد پڑی، اس پر تعمیر ہونے والے نظام تعلیم کے تفصیلی خد و خال اس دور میں ابھرے۔ اسی لئے یہ دور سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس لئے کہ اس نے نظام تعلیم کے تفصیلی مقاصد اور مخصوص مزاج کو تشکیل دیا۔ اور پھر یہ زمانہ وہ ہے، جس میں تعلیمی امور کے بارے میں سب سے زیادہ بحث و مباحثہ ہوا، اور کچھ خاص نتائج پر منتج ہوا۔

سیاسی حیثیت سے یہ دور تاج برطانیہ کی فتح سندھ اور ہندوستان کی محکومیت کا دور تھا۔ برطانوی اقتدار کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کی جو کوششیں ملک کے گوشے میں ہو رہی تھیں، انہیں اس زمانے میں کچل دیا گیا۔ مسلمانوں کی طرف سے ایک فیصلہ کن جنگ ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کی زیر قیادت لڑی گئی، جو در اصل پہلی مثبت جنگ آزادی تھی۔ اس کی ناکامی کے بعد آخری منظم کوشش ۱۸۵۷ء میں ہوئی، جو بجھتے چراغ کی آخری بھڑک ثابت ہوئی۔ اس لئے سیاسی حیثیت سے یہ دور انگریزوں کی فتح پر منتج ہوا اور اہل ہند کے لئے غلامی کی بیڑیاں مقدر

ہوگئیں۔

تعلیمی حیثیت سے ہم اس دور میں مندرجہ ذیل خصوصیات پاتے ہیں۔

۱۔ اس دور میں تعلیم کی پالیسی ماہرینِ تعلیم کے بجائے عمالِ حکومت کے ہاتھ میں تھی۔ جو نہ کوئی تعلیمی تجربہ رکھتے تھے اور نہ فکری حیثیت سے اس کام کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کمی کو محسوس کر کے ۱۸۵۴ء میں حکومت نے شعبۂ تعلیم قائم کیا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس شعبے کو بھی ماہرینِ تعلیم کم ہی میسر آئے اور ایک مورخ کے الفاظ میں یہ شعبہ فوجی افسروں کا ریٹائرنگ روم بن گیا۔

۲۔ اہلِ ہند کو نئی تعلیمی پالیسی اور پروگرام میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ تمام معاملات وہائٹ ہال میں بیٹھ کر طے کئے جاتے تھے اور کلکتے سے نافذ کیے جاتے تھے۔ عد یہ ہے کہ جو انگریز حکام ہندوستان میں تھے، خود ان کو بھی معاملات کا اختیار نہ تھا اور معمولی معمولی معاملات کے لئے ڈور لندن سے ہلائی اور کھینچی جاتی تھی۔

۳۔ قانون ۱۸۱۳ء کا سب سے اہم اثر یہ ہوا کہ مشنریوں کی ایک فوج ظفر موج ملک میں در آئی اور مشنری تعلیمی اداروں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ۱۸۵۲ء-۱۸۸۳ء میں جب کہ تمام سرکاری اسکول اور کالجوں میں صرف ۳۰ ہزار طلبہ تھے۔ عیسائی مشنری تعلیمی اداروں میں اس سے دس گنا زیادہ، یعنی ۳ لاکھ طالب علم تھے۔ یہ مشنری اسکول و کالج صرف بائبل ہی کی تعلیم نہ دے رہے تھے، بلکہ انہوں نے عیسائیت کو پورے تعلیمی نظام میں سمو لیا تھا اور پھر یہ ذریعہ تعلیم بھی انگریزی استعمال کرتے تھے۔ اس زمانے میں عیسائی مبلغین نے کھل کر ہندوستانی مذاہب پر تنقید کی اور ایک بڑی تعداد میں اہلِ ہند کو عیسائی بنا دیا گیا۔

۴۔ کمپنی نے تعلیم سے غفلت کی جو بظاہر ایک معصومانہ پالیسی اختیار کی تھی، اس کے نتائج اس زمانے میں سامنے آنا شروع ہو گئے۔ اور وہ یہ تھے کہ دکھاوے کے لئے تو اوپر کی سطح پر مشرقی علوم کی کچھ سرپرستی ہو رہی تھی لیکن عوامی تعلیم کے لئے مدارس کا جو نظام قائم تھا، وہ سلسلہ قوتِ لایموت کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے سسک سسک

کر دم توڑ رہا تھا۔ اس پورے دور میں پرانا نظام آہستہ آہستہ ختم ہوتا چلا گیا اور حکومت کی پالیسی اس نظام کو جلد از جلد ختم کر دینے کی رہی۔ کمپنی نے پہلے دور میں غفلت اور اس دور میں متشددانہ مخالفت کے ذریعہ پرانے نظام کو موت کی نیند سلا دیا ۱۸۲۴ء میں مسٹر وارڈن اپنی یاد داشت میں اعتراف کرتے ہیں۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم نے ہندوستان میں رہنے والے قوی باشندوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے ہیں۔ ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مٹا دیئے ہیں بلکہ قوم کے اصل علوم بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت فراموش ہو جانے کا شدید اندیشہ ہے۔

ایف ڈبلیو تھامس پرانے نظام کی تباہی کا رونا روتا ہے۔ وہ کہتا ہے: اس نئی متشددانہ پالیسی کی بنا پر گزشتہ پچاس سال میں ہندوستان کا پرانا نظام ختم ہو گیا اور بحیثیت مجموعی ناخواندگی کی سطح بڑھ گئی۔ ۱۸۲۰ء اور ۱۸۸۲ء میں موازنہ کرتے ہوئے وہ بتاتا ہے: اگر پرانا نظام باقی رہتا تو ۱۴ لاکھ طلبہ اسکول و کالج میں تعلیم پا رہے ہوتے، حالانکہ آج زیر تعلیم طلبہ کی تعداد ۳ لاکھ پچاس ہزار ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ پرانے نظام کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی تعداد تعلیم حاصل کر سکی۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے: زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ پرانے نظام کو تباہ کرنے کا کام منظم طور پر شروع ہوا اور ڈائرکٹر تعلیم کو بار بار خوشی اور مسرت کے ایسے لمحات میسر آئے، جو ایک ہی سال میں محض ایک تحصیل میں چھ چھ سو اور سات سات سو مدارس کے بند ہونے سے عبارت تھے۔

پروفیسر لائٹنر (LEITNER) لکھتا ہے: مقامی نظامِ تعلیم کو محکمۂ تعلیم نے تقریباً باقاعدہ طور پر نیست و نابود کر دیا ہے، جس کے نتیجے میں پورے صوبے میں ان لوگوں کی تعداد جو لکھ پڑھ سکتے تھے، ہمارے تسلط کے بعد، بجائے بڑھنے کے گھٹ کر رہ گئی ہے۔

اس دور کی تعلیمی حکمت عملی کا ایک اہم مقصد ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ پرانے نظام کا گلا گھونٹ دیا جائے اس کی ضرب سب سے زیادہ مسلمانوں کے نظام پر پڑی۔

جس کے نتیجے میں علم کی محفلیں سونی پڑ گئیں اور جن محلوں اور دیہاتوں تک میں علم کا چرچا تھا، وہاں جہالت کی تاریکیاں چھا گئیں۔ تاریخ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ انگریز کا سب سے بڑا کارنامہ فروغِ تعلیم نہیں، تباہی ہے۔

۵۔ اس دور کا ایک نہایت ہی اہم پہلو بنیادی تعلیمی معاملات پر بحث و مناظرہ ہے۔ جو نئی تعلیمی پالیسی اس دور میں تشکیل پائی، اسکی پشت پر بہت سے بنیادی اور تفصیلی مباحث ہم کو ملتے ہیں۔ اور یہ دور اس پہلو سے ممتاز ہے کہ حکمراں طبقے کی طرف سے اس کے بعد کے ادوار میں غور و فکر کی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ اس دور کے مباحث کو مختصراً سامنے رکھ دیں۔

الف۔ مقاصدِ تعلیم کے سلسلے میں سامراجی حکمراں طبقے کے درمیان بنیادی اختلاف کم نظر آتا ہے، اس بات پر تقریباً سب متفق نظر آتے ہیں کہ بالآخر مغربی فکر و تمدن کو پھیلانا ہے۔ مستشرقین کا وہ گروہ جو مشرقی علوم کی بقاء کا حامی تھا، وہ ان کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی ترویج چاہتا تھا۔ اس زمانے میں آخری لڑائی لڑ کر ہار گیا اور لارڈ میکالے کی MINUTES نے اس بحث کو تقریباً ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور تعلیم کا یہ مقصد طے پا گیا کہ "اصل چیز مغربی افکار و علوم کی ترویج ہے"۔

دوسرا بنیادی اختلاف اس بارے میں ابھرا کہ آیا تعلیم کو ریاست کی ذمہ داری رہے گی۔

تیسرا اختلاف اس بارے میں تھا کہ تعلیم حصولِ ملازمت کا ذریعہ رہے یا نہیں اور طے ہوا کہ "یہ تعلیم حصولِ ملازمت کا ذریعہ ہے"۔

ب۔ دوسری بحث اس بارے میں تھی کہ تعلیم کا وسیلہ کن اداروں کو بنایا جائے؟

اس بارے میں تین مکاتبِ فکر ملتے ہیں: پہلا اور سب سے مؤثر یہ تھا کہ "اس کا ذریعہ عیسائی مشنری اداروں کو ہونا چاہئے"۔ اس نقطہ نظر کا سب سے اہم وکیل خود مسٹر گرانٹ تھا۔ دوسرا نقطہ نظر یہ تھا کہ "مشنری تعلیمی اداروں کو حکومت مراعات نہ دے، بلکہ بڑی حد تک غیر جانب دار ہو جائے اور ہندوستان کے

پرانے مدارس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہو اور انہی کو نئی تعلیم کا ذریعہ بنائے۔ مستشرقین کا ایک گروہ اس رائے کا حامی تھا۔ تیسرا گروہ مقامی تعلیمی نظام کا سختی سے مخالف تھا اور یہ چاہتا تھا کہ "حکومت کے زیرِ سرپرستی نئے تعلیمی ادارے کھولے جائیں"۔ دوسرے گروہ کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ میکالے اور بینٹنگ تیسرے نقطہ نظر کے حامی تھے، اسی کو غلبہ حاصل ہوا، مگر مشنری تعلیم کی ہر طرح حوصلہ افزائی کو سرکاری پالیسی کا جزو بنا لیا گیا۔

۶۔ بحث کا ایک نہایت اہم موضوع یہ تھا کہ تعلیم کا تصور اور نظام کیا ہو؟ ایک گروہ کا کہنا تھا "چونکہ ہندوستان میں پہلے سے عام تعلیم کا چرچا ہے۔ اور یہی عوام کو فکری، سیاسی اور اجتماعی اعتبار سے اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس لئے ہم اپنے طرز پر عام تعلیم (MASS EDUCATION) کا انتظام کریں"۔ دوسرا گروہ اس رائے کا سختی سے مخالف تھا اور اس کا موقف یہ تھا کہ "تعلیم کو ایک طبقے تک محدود رہنا چاہئے اور یہ طبقہ عوام کے لئے ہمارے وکیل اور ترجمان کی حیثیت سے کام کرے"۔ اسی دوسرے گروہ کی بات کو قبولیت حاصل ہوئی۔ یہ نظریہ جسے اختیار کیا گیا DOWNWARD FILTERATION THEORY کہلاتا ہے۔

۷۔ آخری اہم موضوعِ بحث ذریعہ تعلیم تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اولین ارکانِ حکومت اس رائے کے حامی تھے کہ "سنسکرت اور عربی کو فروغ دیا جائے"۔ لیکن دوسرے گروہ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ عربی اور سنسکرت کو نظر انداز کر کے مقامی زبانوں کی سرپرستی کی جائے اور ان کے ذریعے عوام تک رسائی حاصل کی جائے"۔ تیسرا نقطہ نظر یہ تھا "نہ سنسکرت، نہ عربی اور نہ مقامی بلکہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے"۔ میدان اسی کے ہاتھ رہا۔

ان مباحث کے آئینے میں اس دور کے پورے ذہن کو دیکھا جا سکتا ہے۔

۸۔ تعلیم کے نظام کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ، تعلیمی حکمتِ عملی کا دوسرا بڑا مقصد ایک نئی مسخ شدہ تعلیم کا رواج تھا جو اہلِ ہند کو ان کی تاریخی روایت سے کاٹ کر انہیں

مغرب کا حلقہ بگوش کر دے۔ اس سلسلے میں بنیادی کام تو گرانٹ کی تحریروں اور ۱۸۱۳ء کے چارٹر نے کر دیا تھا۔ اب اس بنیاد پر میکالے نے مزید تعمیر کی۔ میکالے نے مستشرقین کے مکتب فکر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور ان کے نقطہ نظر کی کھل کر تردید کی۔ ۱۸۱۳ء کے قانون میں مشرقی علوم اور علماء کی سرپرستی کے لئے جو گنجائش موجود تھی۔ اس کا ہر دروازہ بند کیا۔ مزید یہ کہ بالکل صاف الفاظ میں اس مقصد تعلیم کا اظہار کیا کہ ہمیں ایسی نسل تیار کرنا ہے، جو دیسی آبادیوں کے لئے ہمارے افکار و نظریات کی ترجمان ہو اور جو رنگ و نسل کے اعتبار سے بلاشبہ ہندوستان کی باشندہ ہو، لیکن فکر و نظر اور سیرت و اخلاق کے اعتبار سے خالص انگریز ہو۔ مشرقی علوم کے لئے جو مالی امداد دی جارہی تھی، اسے بند کرنے کا مشورہ دیا گیا اور اس پر عمل بھی ہو گیا۔ تمام وسائل کو صرف انگریزی تعلیم کے فروغ کے لئے وقف کر دیا گیا۔ میکالے کی ان سفارشات پر مبنی پالیسی کا جو اعلانیہ تیار ہوا، اسے اصطلاح عام میں Bentincks Resolution کہتے ہیں۔ یہ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو منظور کیا گیا۔ جس طرح گرانٹ کے افکار ۱۸۱۳ء کے قانون میں منعکس ہوئے، اسی طرح ۱۸۳۵ء کا یہ اعلانیہ میکالے کے افکار کا آئینہ دار ہے۔ اس قرارداد کے اہم خدوخال یہ ہیں۔

الف۔ "تعلیم کا اصل مقصد یورپی ادب اور یورپی سائنس کا فروغ ہے

ب۔ "ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔

ج۔ "سرکاری خزانے کی تمام رقوم صرف اسی تعلیم پر خرچ ہوں گی۔ ہندوستان کے پرانے تعلیمی اداروں کو جو تھوڑی بہت امداد دی جارہی ہے اسے آہستہ آہستہ ختم کر دیا جائے گا۔

۴۔ اس دور میں ایک اور اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ تعلیم کا تعلق سرکاری ملازمت سے جوڑ دیا گیا۔ تعلیم کا ایک مقصد یہ قرار دیا گیا کہ وہ سرکاری ملازمت کے لئے لوگوں کو تیار کرے۔ خصوصیت سے نچلی سطح کے انتظامی عملے (کلرک) کی فراہمی کا کام انجام دے اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانیہ سے اس قسم کا عملہ لانا مہنگا پڑتا تھا اور اس لئے ضرورت تھی کہ ہندوستانیوں میں سے ہم مشرب و ہم مزاج افراد تیار ہوں۔ جو ان ذمہ داریوں

کو انجام دیں، جن میں پالیسی امور شامل نہ ہوں اور صرف عام نوعیت کے کام کریں۔ دوسری طرف حکومت نے اپنی یہ پالیسی صاف الفاظ میں ظاہر کر دی کہ کھلے اور چھپے دونوں طریقے سے روزگار کے مواقع ان لوگوں کے لئے مخصوص کر دیے جائیں گے، جو نئی تعلیم سے آراستہ ہوں اور یہ دروازے ان لوگوں کے لئے تقریباً بند کر دیئے جائیں گے، جو پرانے نظام تعلیم کی پیداوار ہیں۔

لارڈ ہیسٹنگز تعلیم کے اصل مقصد کو ان الفاظ میں ادا کرتا ہے، ہمارا مقصد ان کالجوں کے ذریعے لوگوں کا ایک ایسا گروہ تیار کرنا ہے، جو اپنے ذہن و اخلاق کے اعتبار سے ہندوستان میں برطانیہ کی سول ایڈمنسٹریشن میں ملازمت کا اہل ہو۔

۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے پارلیمنٹ میں اپنے ایک اعلان کے ذریعے اس بات کا صاف الفاظ میں اظہار کیا: نئے قائم کردہ اسکولوں اور کالجوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ملازمت اور دوسرے تمام معاملات و مواقع میں ترجیح دی جائے گی۔

ہی کیورا اس پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "بس اس طرح وہ روایت مستحکم ہو گئی، جس میں سرکاری ملازمت ہی تعلیم کا مقصد اور منتہا بن گئی۔

۵۔ اس دور کی تعلیمی حکمت عملی کا ایک پہلو یہ تھا کہ اس میں صرف پرانے نظام تعلیم ہی سے ناروا امتیاز نہ برتا گیا، بلکہ ہندوستان کی دو اہم قوموں کے درمیان بھی امتیاز و تفریق کا آغاز نہایت ہی گھناؤنے طریقے پر کیا گیا۔ ہر ممکن کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کا تعلیمی نظام تہس نہس ہو جائے اور ان کے مقابلے میں ہندوؤں کو ہر میدان میں آگے بڑھایا جائے۔ حد یہ ہے کہ ملازمتوں کے لئے اخبارات میں جو اعلانات کئے جاتے تھے، ان میں یہ بھی لکھ دیا جاتا تھا کہ سوائے ہندوؤں کے کسی اور کو ملازم نہ رکھا جائے گا۔ ولیم ولسن ہنٹر (W.W.HUNTER) اس قسم کے متعدد واقعات نقل کر کے لکھتا ہے: "مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ وہ اگر سرکاری ملازمت پانے کی اہلیت بھی رکھتے ہوں، تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ خاص احتیاط کے ساتھ نااہل قرار دے دیا جاتا تھا۔ ان کی بے کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں

اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں ۔۔۔۔۔ کلکتے میں مشکل سے کوئی دفتر ایسا ہوگا، جس میں بجز ادنیٰ پاٹا کے یا دفتری کے، کسی مسلمان کو کوئی نوکری مل سکے"۔ اس طرح انگریزوں کی تعلیمی اور انتظامی حکمتِ عملی کا ایک بنیادی ہدف مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور ہر دائرہ سے ان کو نکال باہر کرتا رہا۔

یہ دور تعلیمی نقطۂ نظر سے سر چارلس کے ۱۸۵۴ء کے "DESPATCH" پر اپنے اختتام کو پہنچا۔ یہ وہ ڈسپیچ پالیسی کے ان تمام مباحث کو، جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے سمیٹ لیتا ہے اور ان بنیادی باتوں کے بارے میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مؤرخین اسے Magna Carta of English Education [illegible] کہتے ہیں۔ اس نے جدید تعلیم کے ان مقاصد کو جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں، ایک قانونی شکل دے دی۔ انگریزی کو مستقل ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے طے کر دیا اور سب سے اہم چیز یہ کہ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کے قیام کو اصولی طور پر طے کر دیا۔

جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے، اس دور میں وہ تعلیمی مسائل کے بارے میں مثبت جدوجہد کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس دور میں دراصل زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے تھے، اپنی ساری قوتیں اور توجہات اس مقصد پر مرکوز کئے ہوئے تھے کہ انگریزوں کو یہاں قدم جمانے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ تعلیمی امور کی بات تو اس وقت پیدا ہوتی، جب وہ ذہنًا اس بات کو مان لیتے کہ انگریز یہاں کی حکمران قوت ہیں اور اب بہ امرِ مجبوری انہیں حقیقت کی مناسبت سے اپنا رویہ وضع کرنا ہے۔ اس دور میں ان کی کوشش یہ تھی کہ ہر موقع پر انگریزوں سے لڑائی مول لی جائے اور کسی طرح اپنے اقتدار کو باقی رکھا جائے۔ وہ مردوں کی طرح لڑے، زخمی شیر کی طرح بار بار حملہ آور ہوئے، لیکن اس جابرانہ قوت کے آگے زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے۔

تعلیمی میدان میں یہ زمانہ مسلمانوں کے لئے زخم کھانے اور چوٹیں سہنے کا زمانہ تھا جو دنیا انہوں نے تعمیر کی تھی وہ لٹ رہی تھی۔ جو بساط انہوں نے بچھائی تھی وہ الٹ رہی تھی۔ انہوں نے تعلیمی مدارس کو بچانے کی ہر ممکنہ حد تک انفرادی کوششیں کیں لیکن تاریخ نے اب ان کے اور ان کے مخالفین کے مقامات کو بدل دیا تھا۔ ان کی حیثیت ایک ہاری ہوئی فوج کی تھی، جسے افق پر دور تک تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک صدی کی کشمکش کے بعد اپنے ہی دیس میں اجنبی اور غلام بنتے چلے جا رہے تھے۔ اور انہیں ان نئے حالات میں، نئے ظالم حکمرانوں کے علی الرغم اپنی منتشر قوتوں کو جمع کرنا اور آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔ اور یہ لائحہ عمل ۱۸۵۷ء کے آخری معرکے کے بعد سامنے آیا، جس کا مطالعہ ہم اگلے دور کے تحت کریں گے۔

تیسرا دور (۱۸۵۴ء - ۱۹۰۵ء)

یہ وہ زمانہ ہے جب برطانوی اقتدار پوری طرح مستحکم ہوگیا تھا اور اقتدارِ اعلیٰ تاجِ برطانیہ میں مرکوز ہوگیا تھا۔ سیاسی حیثیت سے ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور ۱۸۵۷ء کو چھوڑ کر نسبتًا امن و امان کا تھا اور برطانوی اقتدار کی گرفت مضبوط تر کرنے کا باعث ہوا۔ ہندوؤں نے برطانوی راج سے اپنے آپ کو کلی طور پر ہم آہنگ کر لیا تھا اور وہ اس بات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کر رہے تھے کہ موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھا کر اپنے لئے فوقیت کا مقام حاصل کر لیں۔ مسلمان اس دور میں سب سے زیادہ نشانۂ ستم بنے اور برطانوی حکومت کی پوری کوشش تھی کہ اس شجاع اور غیور قوم کی کمر اچھی طرح توڑ دے۔ برطانیہ میں بھی یہ زمانہ غیر معمولی سکون اور ترقی کا زمانہ ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کا راج تھا اور دورِ وکٹوریہ اپنی شان و شوکت، غیر منقطع ترقی، معاشی خوش حالی اور سیاسی اقتدار کی وجہ سے برطانیہ کی تاریخ کا ایک زریں دور تھا۔ اس پس منظر میں خود برطانیہ میں اہم تعلیمی تغیرات ہو رہے تھے۔

۱۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ سرکاری پالیسی کے تعین کے لئے کسی قابلِ ذکر بحث سے خالی ہے۔ جو خطوط دوسرے دور میں طے ہو گئے تھے، اس زمانے میں انہی پر بڑے نظم اور تن دہی سے کام کیا گیا اور انکو عملی جامہ پہنایا گیا۔

۲۔ سب سے اہم یونیورسٹیوں کا باقاعدہ قیام اور مرکزی شعبۂ تعلیم کا قائم کیا جانا تھا۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں سب سے پہلے یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور پھر ۱۸۸۲ء کے "یونیورسٹی کمیشن" کی سفارشات کے نتیجے میں متعدد دوسرے مقامات پر یونیورسٹیاں بنائی گئیں۔ یہ یونیورسٹیاں شروع میں صرف امتحان لینے والا ادارہ تھیں اور ان کے انتظامی امور پر حکومت کی گرفت بہت زیادہ مضبوط تھی۔ شعبۂ تعلیم کے تحت سیکنڈری اور پرائمری تعلیم کی نگرانی کا کام انجام دیا گیا۔

اس بنیادی تبدیلی کے چند اہم نتائج مرتب ہوئے۔

الف۔ تعلیم کا مرکز لندن کے بجائے کلکتہ ہو گیا اور وہائٹ ہال پر وہ انحصار باقی نہ رہا، جو اس سے پہلے کے ادوار میں تھا۔ شعبۂ تعلیم پورے طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں تھا، اور اس میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا، لیکن پھر بھی کلکتہ کے مرکز ہونے کی وجہ سے نظام میں ایک گونہ آزادی اور غیر محتاجگی کی کیفیت پیدا ہوئی۔

ب۔ حکومت نے تعلیمی امور میں اس حیثیت سے دلچسپی لی کہ اس کے مقاصد کہاں تک پورے ہو رہے ہیں اور کس نوعیت کی تبدیلیاں درکار ہیں۔ اس غرض کے لئے ۱۸۵۵ء ہی میں، ایک کمیٹی قائم ہوئی، جس کا مقصد یونیورسٹیوں کے لئے پورا منصوبہ بنانا تھا۔ اس کمیٹی کی سفارشات کے تحت ۱۸۵۷ء کا "انڈین یونیورسٹیز ایکٹ" پاس ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۶۵ء سے لیکر ۱۸۷۱ء تک مسلسل تعلیمی SURVEY ہوتے رہے اور بالآخر ۱۸۸۲ء میں "انڈین ایجوکیشن کمیشن" قائم ہوا، جس نے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اہم سفارشات پیش کیں۔

ج۔ یونیورسٹیوں کے قائم ہونے سے، مغربی طرز کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہندوستان میں ہوا اور اس طرح نئے نظام کو مکمل نشوونما کا موقع ملا۔

د۔ تعلیم میں ایک تدریجی ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، جس کا فائدہ تو یہ ہوا کہ پورا نظام مربوط ہو گیا، لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ثانوی تعلیم بجائے اس کے کہ طلبہ کو زندگی کے لئے تیار کرے، یونیورسٹیز کے لئے درمیانی زینہ بن گئی۔ اس طرح تعلیم کا نظام ملک کے حالات اور ملکی ضروریات سے کٹ گیا۔

ہ۔ اس کے نتیجے کے طور پر حکومت کی گرفت تعلیم پر بہت زیادہ بڑھ گئی اور تقریباً سارا نظام حکومت کے تابع ہو گیا۔ نئے اسکول اور کالج حکومت کے شعبۂ تعلیم کے تحت کھولے گئے اور جو اسکول اس کے تحت نہیں تھے، وہ بھی سرکاری گرانٹ کے ذریعے محکمہ کی گرفت میں لے آئے گئے۔ یہ ایک سانحہ ہے کہ پاک و ہند کی وہ سرزمین جس پر تعلیم کا نظام ایک ہزار سال سے مکمل آزادی کی فضا میں نشوونما پا رہا تھا، وہاں تعلیم حکومت کے زیرِ نگیں آ گئی۔

۳۔ تعلیمی حیثیت سے یہ زمانہ جدید تعلیم کی وسعت و فروغ کا زمانہ ہے۔ پرانا نظامِ تعلیم اس دور میں تقریباً ختم ہو گیا اور صرف وہ سخت جان مدرسے رہ گئے جو سیاست تمدن اور معاشرت کی مار کے بعد بھی اپنے مقام سے نہ ہٹے۔ نیا نظام اس زمانے میں برابر نشوونما پاتا رہا اور اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان اداروں میں بھی زیادہ اہمیت ثانوی تعلیم کو دی گئی۔ پرائمری تعلیم اس پورے دور میں عدم توجہی کا شکار رہی۔ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن نے اس بات کا پرزور الفاظ میں اظہار کیا کہ "پرائمری تعلیم کے حالات بہت غیر تسلی بخش ہیں۔ نیز یہ کہ ثانوی تعلیمی اداروں کی تعداد میں تو ضرور اضافہ ہوا ہے، لیکن معیارِ تعلیم میں کمی واقع ہوئی ہے۔"

۴۔ اس بات کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک طرف حکومت تعلیم پر اپنی گرفت کو

مضبوط تر کرتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن دوسری طرف تعلیم کے لیے جو مالی وسائل فراہم کیے جاتے تھے وہ نہایت ناکافی تھے۔ تقریباً تمام سرکاری رپورٹوں نے اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ تعلیم پر مالی صرفہ ضرورت سے بہت ہی کم ہے۔

۵۔ قومی نقطۂ نظر سے اس زمانے میں ہندوستان میں چند اہم رجحانات رونما ہوئے جن میں سے ہر ایک کے اثرات تعلیم کے دائرے پر بھی مرتب ہوئے۔ ہندوؤں کا ردعمل یہ تھا کہ انھوں نے نئی تعلیم کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور مسلمانوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ ہندوؤں کے ایک طبقے نے ہندو تہذیب اور تاریخ کے نظرانداز کیے جانے پر توجہ ضرور کیا لیکن بحیثیت قوم ان کا رویہ تعاون اور اشتراک عمل تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں دو متضاد بلکہ متحارب رجحانات رونما ہوئے۔ مسلم اکثریت نے نئی تعلیم کا بائیکاٹ کیا۔ بعض اس لیے نہیں کہ اس میں انگریزی کی تعلیم تھی۔ کیونکہ محض انگریزی کی تعلیم پر انہیں کوئی اصولی اعتراض نہ تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ انگریزی کی تعلیم سیکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ مسلمانوں کا اصل اعتراض یہ تھا کہ نئی تعلیم اپنے مزاج، اپنے مقاصد، اپنے نصاب تعلیم اور اپنے اجتماعی ماحول کے اعتبار سے دین اسلام اور اسلامی ثقافت سے کاٹنے اور دور لے جانے والی چیز تھی اور اس کی روح پر مادیت اور عیسائیت کا غلبہ تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا رویہ عدم تعاون کا تھا اور یہ بڑی حد تک پہلی جنگ عظیم تک رہا۔ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کا یہ گروہ کوئی اقدامی اقدام کرنے سے اپنے آپ کو معذور پاتا تھا۔ اس لیے اس نے جس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی، وہ یہ تھی کہ اپنے علمی سرمائے کو جس حد تک محفوظ کرسکے اور اس طوفان کی زد سے بچا لے۔ یہ ایک فاعلانہ نہیں منفعلانہ (PASSIVE) ردعمل تھا، جس پر حالات نے ان کو مجبور کر دیا تھا۔ لیکن مسلمان نیا راستہ نکالنے کے لیے برابر پریشان اور مضطرب رہے۔ اور انھوں نے ایک قابل ذکر کوشش ندوۃ العلماء کے قیام کی صورت

میں کی۔ جس میں قدیم و جدید کے امتزاج کی طرف قدم اٹھایا گیا، نیز ہر موقع پر مسلمانوں نے یہ مطالبہ اٹھایا کہ جدید تعلیمی اداروں میں کم از کم ان کی مذہبی تعلیم کی گنجائش پیدا کی جائے۔ بالآخر اس دور کے اختتام پر یہ منوانے میں کامیاب ہوگئے کہ مسلمان طلبہ کے لیے اسلامیات کی تعلیم کی گنجائش پیدا کی جائے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے خصوصی انتظامات کیے جائیں، تاکہ مسلمانوں میں تعلیم کا اوسط بہتر ہو سکے۔

مسلمانوں میں دوسرا ردعمل ان کا تھا جنھوں نے استعماری نظام تعلیم کو قبول کرلیا اور اس بات کی کوشش کی کہ جس حد تک اس میں اسلامیات کی پیوند کاری کر سکیں کرلیں۔ لیکن بحیثیت نظام کے نئی تعلیم کو قبول کرلیں۔ یہ ردعمل بھی منفعلانہ تھا، لیکن ایک دوسری نوعیت کا۔ اول الذکر گروہ مقاومت کی روش اختیار کیے ہوئے تھا اور آخرالذکر مفاہمت کی۔

اس دور کے اختتام تک نئی تعلیم کے اثرات و نتائج رونما ہونا شروع ہوگئے تھے اور صاف نظر آرہا تھا کہ جہاں اس تعلیم نے برطانوی سامراج کی مشینری کے لیے نئے کل پرزے تیار کر دیئے ہیں، وہیں اس نے اہم ثقافتی اور سیاسی رجحانات کو بھی جنم دیا ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ ملک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک اقلیت اور ناخواندہ سواد اعظم کے درمیان منقسم ہوگیا تھا۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی ربط حتیٰ کہ زبانی، فکری اور جذباتی یگانگت بھی باقی نہ رہی تھی۔ یہ وہ بنیادی ناسور تھا، جو پاک و ہند کی تعلیم ہی کو نہیں یہاں کی پوری ثقافت کو کھاتے جا رہا تھا۔ پھر اس کے نتیجے کے طور پر نئی قیادت ابھری اور یہ اس حیثیت سے نئی تھی کہ ماضی میں قوم کی نمائندگی جن لوگوں نے کی تھی، ان کے مقابلے میں یہ افراد نئے لوگ تھے، جن کی جڑیں قوم میں نہ تھیں اور جو نئے نظام تعلیم کی پیداوار تھے۔

ثانیاً یہ دور شدید ذہنی مغلوبیت کا دور ہے۔ انگریزی تہذیب اپنے عروج کمال پر تھی اور یہاں غلامانہ ذہنیت اپنے شباب پر۔ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے زندگی کا معیاری تصور مغربی زندگی تھا اور ہر دائرہ کار میں اس کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس

نئی روشنی کو پیدا کرنے میں مغربی تعلیم کا فیصلہ کن حصہ تھا، اور جس بنا پر مسلمان مغربی تعلیم کے مخالف تھے، وہ یہی تھی۔

چوتھا دور (۱۹۰۵ء - ۱۹۴۷ء)

۱۹۰۵ء ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم موڑ ہے۔ اس سال تقسیم بنگال واقع ہوئی۔ جس نے یہاں کا نقشہ بدل دیا۔ ہندوؤں کے عزائم کھل کر سامنے آگئے اور انگریزوں کی کمزوری بھی واشگاف ہوگئی۔ اگر ۱۹۰۵ء تک کا دور بحیثیت مجموعی اہل ہند کی طرف سے برطانیہ کے ساتھ خاموش مفاہمت اور مجبورانہ سپردگی کا دور ہے تو ۱۹۰۵ء کے بعد کا دور احتجاج عدم تعاون اور مجاہدانہ کشمکش کا دور ہے۔ اس زمانے میں آزادی کی تحریک از سر نو ابھری اور زندگی کے ہر میدان میں ٹکر لینے کا جذبہ رونما ہوا۔ ادھر پہلی جنگ عظیم نے برطانیہ کے اپنے عالمی مقام کو بھی بے حد متاثر کیا اور وہ جو کبھی سمندروں کی لہروں پر حکمرانی کرتے تھے، سمندر کی لہریں ان کے چنگل سے نکلنا شروع ہوگئیں۔

تعلیمی نقطۂ نظر سے اس زمانے میں کئی اہم رجحانات نظر آتے ہیں۔ اس دور کا آغاز لارڈ کرزن کی فاش گورنری سے ہوتا ہے۔ جس میں اس نے شان تمکنت کے ساتھ محدود تعلیم اور خالص انگریزی تعلیم کے تصور کو از سر نو پیش کیا۔ لیکن اس کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ لارڈ کرزن کی تقاریر قومی غیرت کے لئے تازیانہ ثابت ہوئیں اور قومی تعلیم کا رجحان جن اسباب کی بنا پر پیدا ہوا ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔

اس دور کے اہم تعلیمی رجحانات حسب ذیل تھے۔

۱۔ تعلیمی اداروں کی تعداد میں اضافے کا رجحان جاری رہا اور اس کے ساتھ ساتھ تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش بھی ہوئی۔

۲۔ تعلیمی پالیسی کے نقطۂ نظر سے جو تبدیلیاں نظر آتی ہیں، ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار شعبۂ تعلیم ہندوستانیوں کے کنٹرول میں دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصاب تعلیم اور دوسرے تعلیمی امور میں ہندوستانیوں

کے مختلف مطالبات میں سے کچھ منظور کئے جانے لگے اور حکومت کی یک طرفہ پالیسی کچھ نرم پڑی۔

۳۔ اس زمانے کی سب سے اہم خصوصیت قومی تعلیم اور قومی تحریکات کا وجود ہے۔ ۱۹۰۵ء میں سودیشی تحریک کا اثر طلبہ پر یہ پڑا کہ انہوں نے قومی سیاست میں کھل کر حصہ لینا شروع کیا۔ اس کو گرفت میں لینے کے لئے حکومت نے مختلف نوعیت کے استبدادی اقدامات کئے۔ طلبہ کو خارج کیا گیا، اساتذہ کو مجبور کیا گیا کہ وہ طلبہ پر پولیس کے لئے خفیہ رپورٹنگ کا کام بھی انجام دیں۔ اس پر طلبہ میں ایک آگ سی لگ گئی اور سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کرنا اور آزاد قومی ادارے قائم کرنے کا رجحان رونما ہوا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے بیک وقت نئے قومی اداروں کو قائم کیا۔ بنگال ان سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب "سودیشی تحریک" اور "عدم تعاون کی تحریک" نے اور زیادہ زور پکڑا تو یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا۔ کانگریس نے "نیشنل ایجوکیشن کونسلز" کی پوری تائید کی اور مسلمانوں کی طرف سے قومی تعلیم کے لئے "جامعہ ملیہ" کی شکل میں منظم کوشش ہوئی۔

۴۔ حکومت نے استبدادی حربے استعمال کئے اور یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۹ء تک جاری رہا۔ اس زمانے میں طلبہ اور اساتذہ دونوں کو سیاسی سرگرمیوں سے روکنے اور ان پر حکومت کی گرفت کو مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی اور جبر و تشدد کے ہتھیار استعمال کیے گئے۔ لیکن یہ کوشش آزادی کی تحریک کے پھیلاؤ کو روکنے میں کارگر نہ ہو سکی۔

۵۔ اس دور کی ایک اور خصوصیت بحیثیت مجموعی طلبہ کا سیاسی کردار بھی ہے۔ اس پورے دور میں طلبہ نے سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حصول آزادی کی جدوجہد میں اپنا حصہ ادا کیا۔ سیاسی ارتقاء کے اثرات تعلیمی زندگی پر اور سیاسی ضرورتوں کے لئے نئی تعلیمی راہیں تلاش کرنا اس دور کی اہم خصوصیات ہیں۔

۶۔ اس دور میں یہ احساس اپنی شدت کو پہنچ گیا کہ ہندوستان کا نظام تعلیم قومی

ضروریات کے منافی ہے اور ہر طرف سے اس نظام کو ہدف تنقید بنایا گیا۔ ہندو اس سے اس لیے غیر مطمئن تھے کہ یہ قومی رنگ سے عاری تھا اور مسلمان اس پر اس حیثیت سے تنقید کر رہے تھے کہ یہ قومی رنگ و دین و مذہب اور قومی روایات کو پامال کئے دے رہا ہے۔ اس طرح یہ دراصل اپنے ماقبل کے بظاہر مستحکم دور کے مقابلے میں بیداری اور تغیر کا دور ہے، جس میں اہل ہند بالعموم اور مسلمان بالخصوص اپنی اصل ثقافتی شخصیت کو بچانے کے لئے بے چین و مضطرب تھے۔ تعلیم کا جو خول ان کے گرد بنا دیا گیا تھا، اس سے وہ اپنے آپ کو نجات دلانا چاہتے تھے۔ اور وہ ڈگریں اختیار کرنا چاہتے تھے، جو تعلیم کو ان کی تاریخی ضرورتوں سے ہم کنار کر سکیں۔ لیکن اس کی حیثیت ایک خواہش اور ایک خواب کی تو ضرور تھی ایک حقیقت کی نہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ مجبورانہ نقالی اور جھوٹے اطمینان کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اور اس کی جگہ ایک نئے اضطراب نے لے لی۔

غزل

سالک بستوی

غیر ممکن نہ سہی ان کا نظارا ہونا
پھر بھی کچھ دور نہیں حشر کا برپا ہونا

سخت مشکل ہے غمِ دل کا مداوا ہونا
اور اس دورِ معیشت میں ہے ایسا ہونا

عقل کو چاند ستاروں پہ کمندیں ڈالے
دل کی دنیا میں بہت مشکل ہے اجالا ہونا

اف یہ گھنگھور گھٹائیں مرے ساقی! توبہ
ہائے کیا قہر ہے موسم کا سہانا ہونا

میں نے احساس کے ماتھے پہ شکن دیکھی ہے
غیر ممکن ہے جفاؤں کا گوارا ہونا

ہر نفس خونِ تمنا کی خبر دیتا ہے
موت ہے دل کے لیے عشق کا سودا ہونا

سوزشِ دل سے ہوئے خشک آنسو سالک
میری آنکھوں کا مقدر نہیں دریا ہونا

غیر تعلیم یافتہ طبقے میں دعوت کا کام

خرم جاہ مراد

دعوت کی راہ میں ایک بڑی مشکل تحریک اسلامی کے کارکنوں کا وہ ذہن ہے جو کبھی اس دعوت کا مخاطب صرف اس طبقہ کو سمجھتا ہے جو لٹریچر پڑھ سکے۔ یہ ذہن ایک بھاری اکثریت کا ہے۔ حالانکہ اگر ہمیں تعلیم و تربیت اور جمہوری ذرائع سے انقلاب لانا ہے، تو ہمیں ایک مزدور، ایک رکشہ والے، اور ایک کسان کو بھی اس انقلاب کے لیے اتنا ہی پرشوق بنانا ہوگا جتنا کتابیں پڑھ سکنے والے ہو سکتے ہیں، اور اس کے تصور کی دنیا میں بھی امید کے وہ دیے جلانے ہوں گے جو اسلامی نظام کے نقیب ہیں۔ جب تک ہم یہ نہ سمجھیں گے کہ اب ہم کو ہر طبقہ تک پہنچنا ہے، اور ہر طبقہ سے اسلامی انقلاب کے لیے کارکن بھرتی کرنے ہیں۔ ہر شخص لٹریچر نہیں پڑھ سکے گا اور نہ یہ ضروری ہے۔ اس وقت تک کام کا پھیلنا بہت مشکل ہے۔ یہ بات تو ویسے بھی ہمارے پیش نظر رہنا چاہئے کہ ہم اس داعی اول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ کے پیرو ہیں کہ جو لوگوں کو کمر سے پکڑ پکڑ کر آگ میں گرنے سے بچانے کا کام کرتا رہا اور بلا تفریق کرتا رہا۔

ویسے بھی میرا خیال یہ ہے کہ ان طبقات میں جہاں جدید مغربی تہذیب نے اپنے زہریلے اثرات نہیں پھیلائے ہیں، تحریک کو زیادہ سرفروش کارکن مل سکتے ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بزدلی، منافقت اور مصلحت آمیزی کی صفات کچھ ایسی پیدا ہو گئی ہیں کہ ان کے ساتھ قربانی کے مراحل سے گزرنا کافی مشکل ہوگا۔ لیکن عوام اگر ایک دفعہ بات کی وسعت و گہرائی اور اس کے تقاضے جان لیں، تو زیادہ استقامت سے اس کا ساتھ دیں گے اور اس کے لیے جم جائیں گے۔

اس سلسلہ میں دعوت کو سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کی تربیت دی جانی چاہیے تاکہ کم سے کم اور سادہ الفاظ میں دین کا صحیح تصور اور اس کے تقاضے بے پڑھے لکھے طبقہ کے ذہن نشین کرائے جا سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدنی زندگی کے اواخر میں قبائل

عرب کے وفود کو جس جس طرح دعوت دی گئی ان سے معاملات طے کیے گئے۔ اس سے ہمیں رہنمائی بھی مل سکتی ہے۔ اور یہ بھی پتا چل سکتا ہے کہ مخاطب حضرات کی حدود اور رجحانوں اور مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے دعوت کا طریقہ کتنا متنوع اور جدت کا حامل ہو سکتا ہے۔

نعت

ادریس ضیاء

وہیں برسے گی رحمت بھی خدا کی
جہاں ہوگی اطاعت مصطفےٰ کی
منور کر گئی ہے دونوں عالم
عجب تھی روشنی غارِ حرا کی
ضرورت تھی بہت ایذا رسانی
وہ دعوت دے رہے تھے اک خدا کی
مدینے سے ابھی آئی ہے ہو کر
ادا مت پوچھئے بادِ صبا کی
ستم کے پتھروں کو پھول سمجھا
کوئی دیکھے تو سیرت مصطفےٰ کی
ضرورت کوئی سمجھے یا نہ سمجھے
ضرورت سب کو ہے خیرالوریٰ کی
تصور میں ابھی ان کی گلی ہے
ابھی پوچھو نہ کیفیت ضیاء کی

نعت

نصیر احمد عادل

آپ کی ذات اقدس کا صدقہ ہے یہ
نور سے ساری دنیا جو معمور ہے
دین و مذہب ملا اور قرآں ملا
آپ کے جیسا کوئی پیمبر ملا
سوچتے پر مگر وہ بھی مجبور ہے
کھل کے اقرار چاہے نہ باطل کرے
کیونکہ دنیا کا ہر ایک انسان اب
ہم کو حق ماننے پر بھی مجبور ہے
یہ کرم ہے اسی ذات پر نور کا
نور سے ذہن و دل اپنا معمور ہے
دے دیا آپ نے ایسا طرزِ عمل
جس کے فیضان سے آج سارا جہاں
ساتھ عادل کے دنیا یہ مسرور ہے
نورِ حق کی ضیاؤں میں مسحور ہے

لکھ رہا ہوں جنوں میں میں کیا کیا

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

ابو اللسان اللغوی

مولوی ہدہد بادہ بانی دس کے کمرے میں اکیلے بیٹھے عجیب قسم کی مشق میں مصروف تھے۔ وہ اپنی زبان نکال نکال کر اپنی ناک چھو لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ کبھی کبھار ان کی زبان کا رخ ٹھوڑی چھو لینے کی جانب بھی ہوتا مگر ان کی کاوش زیادہ تر ناک ہی کی طرف تھی اس مشق کی محرک اعلیٰ صوفی لکھیں کی تحقیق تھی ان کا کہنا ہے کہ لمبی زبان والے افراد عدد درجہ خوش قسمت ہوتے ہیں اور اگر کہیں کوئی انسان اپنی زبان سے اپنی ناک چھو لے تو یقیناً آگے چل کر وہ کوئی بڑا آدمی ہوگا۔"______ اپنی اس مشق کے دوران وہ کبھی چونک ہو کر دروازے کی طرف دیکھتے اور کبھی کھڑکی کی طرف اور پھر وہ اپنے مخصوص وظیفے میں منہمک ہو جاتے______ ایک بار کھڑکی کے پٹ نے جھرجھری لی اور اچانک ایک کھٹاکے دار آواز نکلی۔ مولوی ہُدہُد چونک کر اس بری طرح اچھلے کہ میز پر رکھا ہوا شیشے کا پانی کا جگ اشک بن کر پکے فرش کے عارض پر بکھرتا چلا گیا______ مولوی ہدہد کو عاسہلاتے ہوئے اٹھے، ڈرتے ہوئے کھڑکی تک پہنچے اور سہمے سہمے انداز میں انہوں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر جو صورت حال کا جائزہ لیا تو ان پر آشکارا ہوا کہ______

کون آیا ہے یہاں کوئی نہ آیا ہوگا
میرا دروازہ ہواؤں نے ہلایا ہوگا

زبان انسان کے جسم میں______ بعض اہم حیثیتوں سے______ سب سے زیادہ نازک اور حساس عضو ہے______ ایک طرف اسے قوت گویائی جیسی

زبردست طاقت نصیب ہے، تو دوسری طرف وہ اس خمسہ میں ایک عظیم حس "چکھنے کی حس"
پر اس کا قبضہ ہے۔ گویا کہ بیک وقت دو قلمدان اس کے پاس ہیں۔ پھر اس کا بنگلہ بھی
خاصا دلچسپ اور پر شکوہ۔ بتیس سنتریوں کی نگرانی میں وہ کوئی ملکہ عالیہ لگتی ہے کہ
جس کے سامنے زبان ہلاتے ہوئے ملکہ برطانیہ بھی پیچ و تاب کھا بیٹھیں گی ——— اتنی
عظیم صلاحیتوں کی مالک "زبان" کی شکل و صورت بھی کافی دلفریب ہے۔ گوشت کے
اس چھٹانک بھر لوتھڑے کو جب چاہیں آپ در خانۂ دہن گول کر لیں یا بیرون خانہ لمبی۔

ویسے حضرت انسان کو اپنی زبان سے زیادہ خوب صورت "مادرِ گفتار"
کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ ان دونوں کی بنیادی ساخت میں کوئی خاص فرق نہیں؛
پر خوب صورت لگنے نہ لگنے کا معاملہ سراسر دل کا ہے اور دل کب کس پر آجائے گا
کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ویسے صوفی زمان کا قول ہے کہ انسان کو اپنے مقابلے میں دوسرے
کی چیزیں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ ——— پھر اطباء نے بھی محبت کا حق ادا کرتے ہوئے
شاہ جہاں کے "تاج محل" کی طرح اسے بھی "تا قیامت" زندہ و جاوید کر دیا۔ آپ جھوم
جھوم کر کھاتے جائیے اور گنگناتے جائیے "خمیرہ گاؤ زباں است تحفۂ حکماء"

زبان اللہ تعالیٰ کی ایک انمول نعمت ہے اور جو نعمت کی قدر نہیں کرتا اس
سے نعمت چھین لی جاتی ہے لہٰذا بعض لوگ اس کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ زبان سے
باہر، شاید ہی کبھی اسے فرصت سے بیٹھنے دیں۔ عادتاً جو بھی منہ میں آئے زبان
سے باہر، مجال کیا کہ ان کا مد مقابل ان کے نان اسٹاپ لیکچر کے سامنے پلک جھپکنے کی
مہلت پالے۔ غالباً ان کا اصول ہے کہ "خالی بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کچھ کرتے رہنا اچھا"
لہٰذا وہ خواب میں بھی ایسا ایسا خطبہ دیتے ہیں کہ آپ عش عش کریں۔ ——— اور پھر
قدر کرنے کی ایک اچھی شکل یہ ہے کہ جس چیز کی قدر کی جا رہی ہے اس کا پورا پورا حق ادا کر
دیا جائے۔ خون کا حق ہے کہ وہ گردش کرتا رہے۔ دماغ کا حق ہے کہ وہ سوچتا

رہے اور دل کا حق ہے کہ وہ دھڑکتا رہے لہٰذا زبان کا حق ہے کہ وہ چلتی رہے
عالم خیال کے علاوہ عالم خواب میں بھی مسلسل بولتے رہنے کے باوجود بھی حق تو یہ ہے کہ
حق ادا نہ ہوا ——— ادھر بلا خوری کا یہ عالم کہ زبان کو سانس تک لینے کی مہلت نہ
دیں۔ جو جی میں آیا منہ میں ٹھونستے بیٹھیں۔ بھاگ دوڑ کر کسی طرح اگر زبان اپنے لئے کچھ وقت
آرام کا نکال بھی چاہے تو پان بیڑی کے بعد اس شبہے کی نئی ایجاد پان پراگ کی پڑیا منہ
میں چھلانگ مار بیٹھے ——— خیر بے کاری کے مقابلے میں مصروفیت اچھی چیز ہے۔
اسی لئے کسی حکیم کا قول ہے "مصروف ترین شخص کے پاس وقت زیادہ ہوتا ہے"
البتہ تشویش کی بات یہ ہے کہ حد درجہ مصروف رہنے اور آرام کی خاطر دو چار گھنٹے تک
فارغ نہ کر پانے کے نتیجے میں آدمی پاگل ہو جاتا ہے ——— مگر زبان کے بارے میں
یہ دھڑکا قطعاً نہیں رہتا اور اگر خیر سے زبان پاگل بھی ہو جائے تو کیا حرج سونے پر سہاگا
ہی تو ہوگا یعنی کہ کارکردگی میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوگا۔

کچھ لوگ اس درجہ کم گو اور خاموش ہوتے ہیں کہ جیسے شور قیامت سے قبل
بولیں گے ہی نہیں۔ بعض تو اس قدر خاموش طبع ہوتے ہیں کہ [illegible]
ہیں یا بولتا۔ غالباً ان کا عمل اس حدیث شریف پر ہے کہ "بولنا ہو تو اچھی بات بولو ورنہ
خاموش رہو" اور ان کے پاس بولنے کے لئے کوئی اچھی بات ہوتی نہیں لہٰذا وہ مستقل
تالا چڑھائے رہتے ہیں ——— بعض تو اتنا کم بولتے ہیں کہ بنیادی عنصر وجود تک
خطرے میں [illegible] ——— نیز بعض تو اس قدر دھیرے سمع نوازی فرماتے
ہیں کہ جنبش لب کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ گویا وہ بیسویں صدی کے چاند ہیں کہ کبھی کسی نے
سنا اور کسی نے سنا ہی نہیں۔ ان سے بہتر تو سیاسی پارٹیوں کی خواتین کہ صنف نازک
ہونے کے باوجود بھی ہر چہار جانب ہو ہا ہو مچاتی پھرتی ہیں۔

زبان کا مسکن تو منہ ہے اور ہر شخص اسے اپنے منہ ہی میں رکھتا ہے۔ مگر عقلمند لوگ

کی تو وہ منہ کے بجائے اسے اپنے دل میں رکھتی ہے ـــــ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، خاکسار کا کالم "بھوت ہے جب سوار ہو جائے" ـــــ دل کے پاس اپنی زبان "آنکھ" تو پہلے سے موجود ہے پھر زبان دل میں گھسی بیٹھی کیوں کر بیٹھتی ہے اس کا جواب تو عقلمند ہی دیں گے البتہ ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ "ماں دماں میں تیر بہدف" ہونے سے اقوام متحدہ بھی شاید کسی کو روک پائے ـــــ ویسے بہتیرے لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے منہ میں زبان ہے ـــــ خود نابغۂ دیبائی کا یہی حال تھا۔ انہیں قطعاً نہیں معلوم تھا کہ ان کے منہ میں زبان ہے۔ ور پھر کھڑے گھاٹ جب وہ ابلے تو پھر ابلتے ہی چلے گئے ـــــ دس سال پہلے صوفی تمکین کا بھی یہی حال تھا۔ انہیں بالکل نہیں معلوم تھا کہ ان کے منہ میں زبان ہے ـــــ ز بے نصیب پڑوسی کے ساتھ جھگڑا ہوا۔ بات آگے بڑھی۔ پڑوسی ٹیک پٹک ان کے نازک رشتوں پر حملے کر رہا تھا۔ یہ گم صم بیٹھے سنتے رہے مگر جب پیمانۂ صبر لبریز ہوا اور جذبات نے بدن میں سنسنی پھیلائی تو ایک ہی جست میں اسٹیج پر آ کودے اور پھر انہوں نے چھپٹ جھپٹ کر اپنے پڑوسی کو بے نقط وہ وہ صلواتیں سنائیں کہ بیان سے باہر۔ ماں بہن بیٹی کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

عقلمند لوگ سوچ کر بولتے ہیں مگر عقلمندوں کے باپ حد درجہ اعتماد کے طفیل میں بول کر سوچتے ہیں اور بعض تو اس درجہ منیر ہوتے ہیں کہ بولنے کے بعد سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے ـــــ کبھی کبھی یہی حال صوفی تنزیل کا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار وہ اپنی بیوی کو ڈانٹ رہے تھے "کمینی! کبوتر کی اولاد میں تیرے پیٹ سے نکل کر بڑا ہوا پروان چڑھا مگر تو میرا مرتبہ نہیں پہچانتی۔ تجھ سے اطبا کا کہنا ہے کہ جس کی زبان جتنی ہی زیادہ لمبی اور پتلی ہوتی ہے وہ اسی قدر بلند آواز میں فراٹے کے ساتھ بولنے پر قادر ہوتا ہے۔ مثلاً کتے کی زبان چونکہ حد

درجہ لمبی ہوتی ہے لہٰذا اس کی آواز دو کلو میٹر کی دوری سے بآسانی سنی جا سکتی ہے جس آدمی کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہو اور وہ فراٹے کے ساتھ دن رات بولتا ہی چلا جائے آپ سمجھ لیجیے کہ یقیناً اس کی زبان لمبی اور پتلی ہوگی ـــــ اگر وہ بہانہ مانے تو اطمینان قلب کے لئے نکلوا کر دیکھ لیجیے ـــــ دنیا جہان کو اعتراف کم شکایت زیادہ ہے کہ خواتین بولتی بہت ہیں اور ان کی زبان ہمیشہ قینچی کی طرح چلتی ہی رہتی ہے ـــــ اب تو کوئز کمپٹیشن میں سوالات اس طرح بننے سے ہیں کہ "وہ کون سا مہینہ ہے کہ جس میں خواتین باتیں کم کرتی ہیں؟" جواب میں فروری کا مہینہ لکھا جاتا ہے ـــــ آپ اطبا کی اس تحقیق کی روشنی میں بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی ان کی زبان پتلی اور لمبی ہوتی ہے ـــــ خیر یہ تو سرو سے بتانے کا کہ خواتین کے لئے اس تحقیق میں کتنا دم ہے۔ ویسے بول کر سوچنے کا مرض ان کے یہاں بھی متعدی ہے جب کہ اکثریت بول کر سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں فرماتی۔

زبان اظہار مافی الضمیر کا انمول طریقہ ہے مگر اس وقت یہ ذریعہ فیل ہو جاتا ہے کہ جب بات وہاں جا کر اٹک جائے کہ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" پھر تو گفت و شنید کی بین الاقوامی زبان "اشاروں کی زبان" ہی کام آتی ہے ـــــ مگر ایسے مواقع زندگی میں خال خال ہی نظر آتے ہیں ـــــ ویسے گریہ و زاری آہ و بکا، اور نالہ و فریاد کے لئے زبان سے زیادہ موثر کوئی اور ذریعہ نہیں۔ رونے گانے اور آہ و بکا کرنے سے غم ہلکا ہوتا ہے۔ اول درجے کے معشوق اپنے عاشق کا دل قیمہ کر دینے کے ساتھ ساتھ اسے رونے تڑپنے اور نالہ و فریاد کرنے سے بھی محروم رکھتے ہیں کہ عاشق کے بلبلانے اور تڑپنے سے ان کا کلیجہ مزید ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اسی طرح کا ایک عاشق شدت کرب میں بلبلا کر یہاں تک کہہ بیٹھا تھا۔

مناسب یہ ہوگا زبان کاٹ لیجیے ـــــ نہ ہوگی زباں اور نہ فریاد ہوگی

زبان سے ذائقہ لینے کو کام بھی کافی قدیم ہے۔ بعض لوگوں کی زبان تو اس قدر حساس ہوتی ہے کہ لقمہ رکھتے ہی شئی اکول کا شجرۂ نسب مع حدود اربعہ بیت اس طور بتاتی ہے کہ دیسا بابا شہید کے مزار کا جوڑا کا ہے کو بھی بتائے ـــــ ایک بار مولوی بُدبُد کے ساتھ کسی دعوت میں جانا ہوا۔ انہوں نے شوربہ چکھتے ہی رزلٹ سنایا۔ "لے یار یہ تو مرغے کے بجائے مرغی کا گوشت ہے۔" ایک دوسرے مولوی صاحب جو اسی دعوت میں آئے تھے گوشت کے درمیان سے ایک ٹانگ اٹھا کر بولے "یہ تو مرغی کی بائیں ٹانگ ہے نہ جانے دائیں ٹانگ کس کے حصے میں پڑی ہوگی۔"

ویسے کچھ بھی ہو زبان ہے تو جہان ہے۔ کھانے کا مزہ اسی زبان کی مرہون منت ہے ورنہ معدہ سے معدہ غذا بیکار۔ اسی لئے صوفی نمکین کہتے ہیں "جو زبان سے نیچے چلا وہ پانی میں گیا، پھر کھایا نہ کھایا برابر ہوا" ـــــ زبان کی بھرپور لذت تو صوفی رولان لیتے ہیں۔ بعد نماز فجر ناشتے کے بعد پان کی گلوری جو وہ منہ میں دبا لیتے ہیں تو وہ اگلوپان اذان ظہر تک اس شان سے ان کا ساتھ نبھاتا ہے کہ ظہر کے وضو کے وقت ان کے منہ سے مسلم گلوری ہی اچھلتی ہے کہ اگر نماز بھی نہ ادا کرنی ہوتی تو وہ اگلوپان نہایت آب و تاب کے ساتھ بستر خواب تک ان کے ساتھ جاتا۔

بعض لوگوں کو دوسروں کی زبان پر قطعاً بھروسہ نہیں ہوتا۔ لوگ لاکھ بتاتے ہیں کہ فلاں چیز کا ذائقہ ایسا ہے اور ویسا مگر جب تک وہ خود نہ چکھ لیں انہیں اطمینان نہیں ہوتا ـــــ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو عقل و خرد کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جب تک وہ زبان سے نہ چکھ لیں انہیں تسلی ہی نہیں ہوتی ـــــ خود حافظ شتواں کا واقعہ ہے ـــــ ایک دن وہ گاؤں کے پورب والی پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں عین راستے میں زمین پر ایک فٹ میں پھیلی ہوئی کالی کالی کوئی چیز نظر آئی۔ اب تو ان کے قدم رک گئے۔ وہ اور قریب ہوئے۔ غور سے دیکھا مگر کچھ

سمجھ میں نہ آیا۔ اب وہ اس پر جھکے مگر بے سود رہے ـــــ آخر انہوں نے اس کالی کالی چیز پر انگلی سے ٹھوکا مارا اور اوپر اٹھا کر آنکھوں سے بغور دیکھا مگر پھر بھی کچھ سمجھ میں نہ آیا ـــــ اب ناک کی باری تھی انہوں نے انگلی لے کر جا کر نتھنوں سے ایک آہ سرد کھینچی مگر وہ گتھی پھر بھی نہ کھلی ـــــ آخر کار انہوں نے اسے زبان پر رکھا اور پھر زبان پر رکھتے ہی وہ ہنکارے "تھو تھو، تھو تھو ـــــ لے کمبخت یہ تو گوبر ہے۔"

بعض لوگ مافی الضمیر کی ادائیگی اور زبان سے ذائقہ چکھنے کی بابت اپنے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے ـــــ کافی پرانا واقعہ ہے ـــــ ایک بار پولیس میری گرفتاری کے لئے آئی۔ گاؤں میں جب پولیس آتی ہے تو سید فردوسی کے یہاں ٹکتی ہے ـــــ سید فردوسی نے نوکر کو دوڑا کر مجھے بلا بھیجا ـــــ میرے پہنچتے ہی سید فردوسی اسٹارٹ ہو گئے۔ اور باوجودیکہ سید فردوسی کو میرے کیس کے بارے میں کچھ زیادہ واقفیت نہیں تھی مگر میرے دفاع میں وہ نہ جانے کہاں کہاں سے ایسی ایسی سیدھی باتیں انڈیل رہے تھے کہ میں بھونچکا رہ گیا گویا کہ مدعی سست گواہ چست کا سماں بندھا ہوا تھا۔ میں کچھ بولنے کی کوشش کرتا تو سید فردوسی ہاتھ ہلا کر ہنکارتے "وار دو نذجی! میں اس کے بارے میں اس سے زیادہ جانتا ہوں" ـــــ اور میں سینہ تھام کر دل ہی دل میں یہ شعر پڑھتا ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں — کوئی پوچھے کہ مدعا کیا ہے

معاملے تمام ہونے کے بعد اب کھانے کی باری تھی۔ سید فردوسی نے سرکاری کتوں کے لئے مرغ مسلم پکوا رکھا تھا ـــــ دسترخوان بچھا تو قطع نظر اس کے کہ میں بھی ایک نوکیلی کرسی پر براجمان تھا سید فردوسی سرکاری کتوں سمیت دسترخوان پر ٹوٹ پڑے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سید فردوسی گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے میں تھوڑی دور پر بیٹھا ہوا یہ سارا تماشا بچشم سر دیکھ رہا تھا ـــــ مجلس ختم ہوئی تو

چلتے چلتے میں نے سید فردوسی کے کان میں چپکے سے کہا۔

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں — کوئی پوچھے کہ مدعا کیا ہے

اب سید فردوسی چونکے ـــــ وہ میری طرف پلٹے کہ پیچھے سے کچھ معافی مانگ کر مگر اتنی دیر میں ان سے میں کوئی دس گز دور اپنے گھر کے راستہ پر تھا۔

کالم اپنی عمر کو پہنچ گیا جب کہ "زبان کی لغزش" "زبان کا زخم تیر کے زخم سے زیادہ شوخ" "زبان کا گوشت سب سے اچھا اور سب سے برا بھی" "تنقید کرنے والوں کی زبان کا کرشمہ" اور "سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے" جیسے اموی پہ ڈھیروں باتیں بھی زیر کرنی باقی تھیں پر کیا کریں مجبوری کا نام اجازت بھی کہ اللہ حافظ۔

نحوی زندہ صحبت باقی

غزل

مدہوش بلگرامی

اب جہاں میں وہی منظر پس منظر جاگے
جس سے ہر دل میں محبت کا سمندر جاگے

جستجو کس کی ہے انکو بھی خدا ہی جانے
ماہ و اختر جو مرے ساتھ ہی شب بھر جاگے

خواب غفلت میں پڑے تھے یہ نہ جانے کب سے
لٹ چکا قافلہ جب اپنا تو رہبر جاگے

دن کے ہنگاموں نے مہلت ہی نہ دی تھی مجھکو
رات آئی تو مرے ذہن میں پیکر جاگے

وسعتِ چرخ سمٹ آئے گی اک نقطے میں
دیکھ لینا دم پرواز جو شہپر جاگے

عمر بھر غیر سمجھتا رہا جن کو مدہوش
جب پڑا وقت تو آنکھوں میں وہ پیکر جاگے

وفیات

محمد سہیل فلاحی

مولانا نجم الدین اصلاحی

یہ دنیا ایک مسافر خانہ ہے۔ جو یہاں آیا ہے اسے ایک روز یہاں سے جانا ہے۔ بڑے افسوس ہے کہ علامہ حمید الدین فراہی کے شاگرد، مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی کے رفیق درس اور سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی مرحوم سابق ناظم جامعۃ الفلاح مولانا صدر الدین اصلاحی اور نائب ناظم جامعۃ الفلاح مولانا ابو بکر اصلاحی کے استاد مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی ۱۲ اگست ۱۹۹۳ء کو اپنے وطن راجہ پور سکرور، اعظم گڑھ میں وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے ایک عرصہ تک مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تدریسی خدمات انجام دی ہیں ۱۹۳۵ء میں وہاں سے الگ ہوئے۔ پھر سدھاری، اعظم گڑھ کی ایک چھوٹی مسجد میں بے عرصہ تک قیام رہا، جہاں تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ دیوبند سے شائع ہونے والے رسالہ "تذکرہ" کی ادارت بھی یہیں سے کرتے۔ مولانا آزاد تعلیمی مرکز، اسرہٹا، جونپور کی مجلس منتظمہ کے صدر بھی رہے۔ دلائل السنن، مکتوبات شیخ الاسلام، یادگار سلف، سیرت شیخ الاسلام، انتخاب رباعیات مولانا روم وغیرہ آپ کی معروف تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ بیشمار مضامین اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

جامعۃ الفلاح کے اساتذہ سے مرحوم محبت فرماتے تھے، کہا کرتے تھے میرے انتقال کی خبر ملنا ضرور آنا۔ ان کے لڑکے حافظ محمد سعد صاحب نے بتایا کہ مرنے کے پہلے انہوں نے تاکید کی تھی کہ جامعۃ الفلاح انتقال کی خبر ضرور بھیجی جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ جامعۃ الفلاح خبر نہیں پہونچ سکی۔ مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی اور مولانا محمد عنایت اللہ صاحب سبحانی اتفاق سے اسی علاقہ میں ہونے کی وجہ سے شریک جنازہ ہو گئے۔ انتقال کے تیسرے دن سکریٹری انجمن مولانا محمد عمران صاحب فلاحی، مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی، مولوی مطیع اللہ صاحب

فلاحی اور راقم پر مشتمل ایک وفد ان کی قبر پر پہونچا اور دعائے مغفرت کی۔

ان کے بارے میں یہ بات سنی ہے کہ انہوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو اپنے گاؤں راجہ پور سکرور مدعو کیا تھا اور اپنی اہلیہ کی انگوٹھی بیچ کر مولانا مودودیؒ کی ضیافت کی تھی لیکن زیادہ دنوں تک جماعت اسلامی سے تعلق برقرار نہ رہ سکا۔ وہ بالترتیب مولانا سید محمد امین نقشبندی، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہوتے رہے۔ شیخ الاسلام کے ساتھ تحریک آزادی ہند میں حصہ بھی لیا۔ لیکن ان سب کے باوجود سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم سے تعلق خاطر تھا، انہیں کے بقول مولانا ابواللیث اصلاحی مرحوم کا یہ بیٹا ہے اکثر خدمات میں حاضر ہوا کرتے اور ایک خاص قسم کا ستو انہیں تحفہ میں بھیجا کرتے۔ مولانا ابوالاسلام آزاد کے ذریعہ حکومت سے پنشن جاری ہوئی جو تاعمر انہیں ملتی رہی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور جنت میں جگہ دے۔ آمین۔

ماسٹر قدرت اللہ صاحب ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ انسپکٹر آف اسکولس کی طرف سے پرائمری درجات کے اساتذہ کے لئے لگائے گئے ایک کیمپ کے دوران نماز کا وقت آنے پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا گیا "ارے پوجا پاٹ بعد میں" اتنی کہ انہوں نے استعفا لکھا اور دامن جھاڑ کر یوں چل دیئے جیسے شیر زنار کو جا رہے ہوں۔ یہ تھے جناب ماسٹر قدرت اللہ صاحب مرحوم مطیع اللہ صاحب فلاحی کے والد۔ ایک پرائمری اسکول میں ہیڈ ماسٹر اردو بھی "اعلیٰ قابلیت" پاس اور گورکھپور سے نارمل ٹیچر ٹریننگ کئے ہوئے۔ دوراول کے ان تحریکی کارکنوں میں سے ایک جو اپنی کشتیاں جلا کر قافلہ سخت جان میں شامل ہوئے تھے۔ انتہائی افسوس ہے کہ ۲۶ اگست ۱۹۹۹ء کو وہ وفات پا گئے اور اپنے اہل خانہ اور متعلقین کو سوگوار چھوڑ گئے۔ گھر ہی کے متصل قبرستان میں مولانا جلیل حسن ندوی مرحوم کے پہلو میں ابدی نیند سو گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے نظام باطل سے استعفا کے بعد اپنے گھر سے قریب جھکیہا، ضلع بستی میں ایک

مکتب قائم کر لیا۔ اپنے بچوں کو بھی سرکاری اسکول سے نکال کر اسی میں داخل کیا۔ تمام عمر اسی میں دعوت و تبلیغ میں مشغول رہے۔ ان کا گاؤں سلون جوت مثالی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یکساں مقبول تھے جس کا نتیجہ تھا کہ گاؤں کے بیشتر معاملات گاؤں ہی میں سلجھا لئے جاتے اور کوئی مقدمہ سرکاری عدالت تک نہیں جاتا۔ سادگی، قناعت اور اخلاص کے ساتھ مسلسل جد و جہد ان کی خوبی تھی۔ اجتماعات میں شرکت کی اہمیت کا اندازہ آپ لگائیے کہ جھکیہا سے جونپور تک سینکڑوں میل کی مسافت سائیکل سے طے کی اور اجتماع میں شریک ہوئے۔ جب تک دم میں دم رہا اور پیروں میں طاقت، کوئی اجتماع نہیں چھوڑا۔ سابق قیم جماعت مولانا افضل حسین مرحوم کے بقول "تحریک کو انہوں نے صحیح معنوں میں سمجھا ہے" اور بقول امیر حلقہ یوپی مولانا رفیق احمد صاحب قاسمی "اقامت دین کا مخلص سپاہی بے لوث اور بے تکان کام کرنے والا مجاہد ہم سے جدا ہو کر اپنے رب سے اجر و ثواب لینے اس کے جوار رحمت میں پہونچ گیا۔" اللہ ان کے اعمال کو شرف قبول بخشے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

غزل

آزاد قمر گھبری
واٹش بلڈ پور باندہ، فیض آباد (یوپی)

غلط دستور میخانہ نہیں ہے
تو کیوں ہاتھوں میں پیمانہ نہیں ہے

وفا کرتی نہیں دنیا کسی سے
حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں ہے

خردمندوں کی بن آئی ہے پھر سے
کوئی بستی میں دیوانہ نہیں ہے

بہر لحظہ ہے لازم ہوشمندی
یہ وادی کوئے جانانہ نہیں ہے

ملے ہیں چند سکے بوسر شام
یہ مزدوری ہے نذرانہ نہیں ہے

اگرچہ گنج قاروں ہاتھ میں ہے
مگر خوئے کریمانہ نہیں ہے

جو مجھ سے بدگماں ہیں ان سے کہہ دو
قدم میرا حریفانہ نہیں ہے

نقیب حریت آزاد ہوں میں
مری فطرت غلامانہ نہیں ہے

تعارف وتبصرہ

عبدالبر اثری فلاحی

وقت کی اہمیت

مصنف: علامہ یوسف القرضاوی
مترجم: مولانا عبدالحلیم فلاحی

قیمت: ١٦ روپئے ، کتابت وطباعت: عمدہ ، صفحات: ١١٩

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی ١٣٥٢ چتلی قبر دہلی ٦

علامہ یوسف القرضاوی عالم اسلام کی ایک مایۂ ناز شخصیت ہیں۔ اور اپنی علمی دینی اور تحریکی خدمات کے لئے کہیں بھی محتاج تعارف نہیں۔ آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ نے قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ زیر تعارف کتاب مولانا کی ایک قیمتی تصنیف "الوقت فی حیاۃ المسلم" کا اردو ترجمہ ہے۔ مولانا نے یہ کتاب کیوں لکھی مقدمے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

"میں "وقت" اور مسلمان کی زندگی میں اس کی قدر وقیمت کے عنوان سے اب تک میں لکھ رہا تھا کہ دوران مطالعہ قرآن وسنت میں وقت سے متعلق حد درجہ اہتمام نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ ان صفحات کو میں کتابی شکل دے دوں۔

دوران مطالعہ میں نے دیکھا کہ قرون اولیٰ کے مسلمان اپنے اوقات کے سلسلے میں اتنے حریص تھے کہ ان کی یہ حرص ان کے بعد کے لوگوں کی درہم و دینار کی حرص سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اسی حرص کے سبب ان کے لئے علم نافع، عمل صالح، جہاد اور فتح مبین کا حصول ممکن ہوا، اور اسی کے نتیجے میں وہ تہذیب وجود میں آئی جس کی شاخیں ہر چہار جانب پھیلی ہوئی ہیں۔

پھر میں آج کی دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ رہتے ہوئے دیکھ رہا ہوں کہ وہ کس طرح سے اپنے اوقات کو ضائع کر رہے ہیں، اور اپنی عمریں لٹا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ اس سلسلے میں بے وقوفی سے گزر کر مدہوشی کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ آج وہ قافلۂ انسانیت کے پچھلے حصے میں ڈھکیل دیئے گئے ہیں۔ حالانکہ ایک دن وہ بھی تھا کہ اسی قافلے کی زمام کار ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور موجودہ دور میں انہوں نے نہ اہل دنیا کی طرح اپنی دنیا بنانے کا کام کیا، اور نہ دین داروں کی طرح اپنی آخرت بنانے کا، بلکہ دنیا و آخرت دونوں برباد کرلی، اور نتیجۃً دونوں جہان کی نعمتوں سے محروم ہو گئے"۔ (ص ٨)

یہ کتاب کن مباحث پر مشتمل ہے اسے سمجھنے کے لئے فاضل مترجم کے مندرجہ ذیل کلمات انتہائی جامع ہیں اس لئے اسے ہی نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"فاضل مصنف نے اس کتاب میں وقت کی اہمیت کے موضوع پر نہایت عمدہ اور مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ سب سے پہلے موصوف نے قرآن و سنت میں وقت کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی شعائر و آداب کس طرح کسی مسلمان کے اوقات کو منضبط کرتے ہیں اور وہ پابندی اوقات کا عادی بن جاتے ہیں۔ مگر اسلام کے اس زریں نظام سے ماضی و حال کے لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو ان شعائر و آداب کی پابندی کریں جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں ڈاکٹر صاحب نے ماضی، حال اور مستقبل کے زمانوں سے متعلق پائے جانے والے تصورات و نظریات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور ان کا آپریشن کر کے ان کے نقائص و معائب کو بھرپور طریقے سے واضح کیا ہے۔

پھر آگے چل کر ان تینوں زمانوں سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر کی نہایت عمدگی سے وضاحت کی ہے، اور اسے گوناگوں دلائل سے مدلل کیا ہے۔ اور اس بات پر زور دیا ہے کہ وقت سے متعلق افراط و تفریط کے درمیان اسلام ہی وہ اعتدال پسندانہ تصور پیش کرتا ہے۔ (ص ۵-۶)

الحمدللہ فاضل مترجم نے بہت ہی عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اردو زبان ہی میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ حالانکہ یہ ان کی پہلی کوشش ہے جو کتابی شکل میں منظر عام پر آئی ہے۔ البتہ بعض مقامات پر آیات کے ترجمے کھٹکتے ہیں مثلاً صفحہ نمبر ۱۲ پر سورۂ آل عمران آیت ۱۳۷ قد خلت من قبلکم سنن ..... الآیۃ میں "سنن" کا ترجمہ "دور" کیا گیا ہے۔ جو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ اس سے اس لفظ کا واقعی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ "سنن" سے تو اللہ کے اس قاعدے اور ضابطے کو کہتے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اطاعت کیشوں کو سربلند کرتا ہے اور نافرمانوں کو تباہ و برباد کرتا ہے۔

بعض مقامات پر آیت کے بعض حصوں کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے مثلاً ص ۳۲ پر۔ اسی طرح بعض مقامات پر آیت کی کتابت غلط ہو گئی ہے مثلاً ص ۲۸ پر۔

ان تمام کے باوجود کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ جسے ہر فرد کو ضرور پڑھنا چاہئے۔ خواہ عمر کے کسی مرحلے میں ہو اور کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ اس لئے کہ اس میں ہر ایک کے لئے اپنے اوقات کے مناسب استعمال کے سلسلے میں صحیح رویے کی نشاندہی کی گئی ہے، اور غلط رویوں کے نقصانات سے باخبر کیا گیا ہے۔ اس سے واقفیت ہی ہمیں اپنے احتساب کا موقع دے گی اور صحیح روش اپنانے پر مہمیز کرے گی۔ اللّٰھمّ وفقنا و اعنا۔

جامعہ کے لیل و نہار

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعۃ الفلاح پہلے نمبر پر

جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی جانب سے جامعہ محمدیہ مالیگاؤں میں ہر سال لگنے والے تدریبی کیمپ میں پچھلے کئی سالوں سے اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے طلبہ شریک نہیں ہو سکے تھے اس سال بعض ذرائع سے اطلاع ملنے پر جامعۃ الفلاح کے دو طلبہ نے شرکت کی جس میں خوشی ہے کہ ہمارے طالب علم عزیزی محی الدین غازی سہاقی نے پہلی پوزیشن حاصل کی جب کہ دوسرے اور تیسرے نمبر پر دارالعلوم ندوۃ العلماء اور جامعہ دارالسلام عمرآباد کے طلباء تھے۔ ہم جامعہ محمدیہ کے ذمہ داران کے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہمارے طلبہ کو موقع دیا اور امید رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی وقت پر اطلاع مل جایا کرے گی تاکہ تیاری کے ساتھ زیادہ مستحق طلبہ شریک ہو سکیں۔

ایک اور کل ہند بین المدارس انعامی تحریری مقابلہ جمعیۃ ابرار الاسلام، ۵۔ سبحان روڈ علیگڑھ کی جانب سے ہوا تھا جس میں جامعۃ الفلاح کے طالب علم عزیزی طفیل احمد بن زبیر احمد نے پہلا انعام حاصل کیا۔ طفیل احمد کے مقالہ کا عنوان "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" (از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم)۔ "تلخیص و تبصرہ" تھا۔

اجلاس مجلس منتظمہ

طے شدہ پروگرام کے مطابق جامعہ کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ء تا ۵ اکتوبر ۱۹۹۳ء جامعہ میں ہوا۔ اعظم گڑھ کے ممبران انتظامیہ کے علاوہ علیگڑھ سے مولانا جلال الدین انصر صاحب عمری، دہلی سے جناب محمد اشفاق صاحب اور نسیم غازی صاحب فلاحی، گورکھپور سے مقبول احمد صاحب فلاحی شریک ہوئے۔ جناب حکیم عبدالباری صاحب فلاحی جامعہ ہمدرد دہلی سے بحیثیت مدعو خصوصی تشریف لائے۔ اجلاس میں مجوزہ نئے دستور پر بحث کے علاوہ نئے اسکیل پر غور کرنا تھا۔

اس موقع پر مولانا جلال الدین انصر صاحب عمری کی تذکیر ہوئی جس میں موصوف نے

سورہ حدید آیت نمبر ۱۶ کی روشنی میں فرمایا کہ کسی قوم کے درمیان خدا کا رسول موجود ہو، اس کی کتاب نازل ہو رہی ہو اور مسلسل آیات الٰہی کا نزول ہو رہا ہو پھر بھی اگر دل نہ پگھلیں تو یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے۔ انسان کے سامنے خدائی کتاب کا حوالہ دیا جائے اور اس کے رسول کی سنت رکھی جائے پھر بھی وہ اپنی کہے اور اپنی کرے تو اس سے دل سخت ہو جایا کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے دل اسی بنا پر سخت ہوئے تھے۔ انسان کے لئے کتاب الٰہی سے بڑھ کر ہدایت کی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب کو اسی حیثیت سے پڑھنا چاہئے کہ اس پر عمل کرنا ہے اور اس نظام حق کو دنیا میں غالب کرنے کی سعی کرنی ہے۔ اگر یہ جذبہ نہیں تو لاکھ اسکے رموز معلوم کئے جائیں اور نکتے تلاش کئے جائیں اس کتاب کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

شعیب انصاری صاحب جامعۃ الفلاح سے علیحدہ

جناب ماسٹر شعیب انصاری صاحب جو یہاں پچھلے کئی ماہ سے استاد تھے اور جن کا تقرر عارضی تھا اب جامعہ سے انکا تعلق ختم ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے تشریف لے جا چکے ہیں۔

نیا تقرر

شعبۂ تنظیم مدارس میں جناب اقبال واجد صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی دارود گیا مطبخ میں جناب محمد ابراہیم صدیقی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ٹی بنارس اور مسجد اور مہمان خانہ کے انچارج کی حیثیت سے جناب عبدالخالق صاحب دربھنگہ کا تقرر عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو انکی مفوضہ ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایک علمی تحفہ

استاد جامعہ مولانا محمد عنایت اللہ سبحانی نے چند سال پہلے امام محمد یونیورسٹی ریاض سے تفسیر قرآن میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ آپ نے جو تھیسس پیش کی تھی وہ قرآن پاک کی تین عظیم سورتوں ــــ فاتحہ، بقرہ، آل عمران ــــ کے نظم و اسلوب، اعجاز بیان اور ربط آیات سے تعلق رکھتی ہے، یہ عظیم اور گراں قدر تحقیقی کاوش "البرھان فی نظام القرآن" نہایت آب و تاب کیساتھ چھپ کر منظر عام پر آگئی ہے۔ یہ کتاب قرآنی اسرار و حکم کے انمول موتیوں سے مالا مال ہے اور عرب و عجم کے متعدد اساطین علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ یہ ایک عظیم تحفہ ہے ہر طالب قرآن اور ہر علمی لائبریری کے لئے۔

وضو گاہ جامعہ کی مسجد میں وضو کے لئے حوض کافی نہیں تھا۔ اب بڑی تعداد میں وضو کے لئے نل لگ گئے ہیں اور پانی کے لئے عارضی ٹنکی کا بھی نظم ہو گیا ہے۔

طاعون سے بچاؤ کیلئے احتیاطی تدابیر

ملک میں پھیلی ہوئی وبا کے پیش نظر جامعہ میں صفائی کا خصوصی اہتمام کیا گیا اور حفظ ما تقدم کے لئے طلبا اور طالبات میں دوائیں تقسیم کی گئیں نیز یہ مہم قرب و جوار میں بھی چلانے کی کوشش جاری ہے۔

غزل

قمر رام نگری

رب کو رب کوئی مانتا ہی نہیں
کون ہے رب یہ کچھ پتا ہی نہیں

سوکھی دھرتی کو کر دے جو جل تھل
ایسا بادل کوئی اٹھا ہی نہیں

نفسی نفسی پڑی تو ہے لیکن
حشر قائم ابھی ہوا ہی نہیں

کون ننگا ہے کون بھوکا ہے!
کیوں کسی کو یہ سوجھتا ہی نہیں

جو نہ پژمردہ ہو خزاں میں بھی
پھول ایسا کہیں کھلا ہی نہیں

جرم کر کے بھی مطمئن ہیں لوگ
ایسا لگتا ہے کچھ برا ہی نہیں

حشر کیا ہوگا ظلم ڈھانے کا
آہ! اب کوئی سوچتا ہی نہیں

[illegible] آج قاتل ہے
جیسے ان کے لئے سزا ہی نہیں

کس غرض سے ہمیں بنایا گیا!
اب کا انسان جانتا ہی نہیں

آج دنیا والوں کا حال کیا کہئے
جیسے ان کا کوئی خدا ہی نہیں

[illegible]
مجھ کو ایسا کوئی ملا ہی نہیں

[illegible]
اب دلوں میں وہ رابطہ ہی نہیں

[illegible]
اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہی نہیں

حلقۂ یاراں

مکرمی و محترمی ایڈیٹر ماہنامہ حیات نو صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ
امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا

جولائی ۱۹۹۷ء کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ کافی پسند آیا۔ اداریہ خاتون جنت کے رہنما نقوش۔ پڑھکر کوئی بچو نک دے اپریل۔ مئی جون۔ اچھے رہے محترم ابو اللسان لغوی صاحب کا مزاحیہ مضمون کافی دلچسپ ہے۔ اس طرح کے مضامین کی آج کل بے حد ضرورت ہے۔ آپ اس کالم کو ضرور جاری رکھیں۔

چند باتوں کی جانب توجہ دیں تو حیات نو مزید ترقی کر سکتا ہے ان شاء اللہ

کتابت کے معیار کو بلند کیا جائے۔ مضامین کے انتخاب میں خصوصی توجہ دی جائے نیز پرچہ وقت پر نکالنے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ ترقی عطا کرے۔ آمین ثم آمین

اب جدا ہوتا ہوں بقیہ آئندہ
اساتذہ و احباب کی خدمت میں سلام سنائیں

والسلام
اظہر الدین فلاحی
جامعہ مصباح العلوم چوکونیاں

حلقۂ یاراں

مکرمی سلام مسنون
امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا

مئی۔ جون کا مشترکہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ ابو اللسان لغوی صاحب کا کالم "یہ بھی اچھا ہوا بہانہ ہوا" بے حد پسند آیا۔ آپ یہ کالم جاری رکھیں اور میری طرف سے محترم لغوی صاحب کو مبارکباد پہنچا دیں۔

حلقۂ یاراں کے تحت کسی رضوان احمد صاحب فلاحی کا مراسلہ پڑھ کر حد درجہ افسوس ہوا۔ مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ حیات نو جیسے سنجیدہ اور معیاری پرچے میں آپ نے انتہائی غیر معیاری اور گھٹیا خط شائع فرما کر پرچے کے معیار کو مجروح کر دیا اس طرح کے خطوط سے اجتناب کیا جائے، تو پرچے کے حق میں بہتر ہوگا۔

ایک دورے کے دوران دار العلوم عمر آباد میں مولانا ابو البیان حماد صاحب سے ملاقات کے دوران لغوی صاحب کے کالم کا ذکر آیا وہ اچھے کرتے ہیں انہوں نے بھی رضوان صاحب کے خط کو غیر سنجیدہ قرار دیا ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے ورنہ مراسلے کا بھرپور تعاقب کرتا۔ بقیہ کل خیریت۔ اراکین ادارہ کو سلام سنائیں۔

والسلام
واصف اقبال
چترپور، ہزاری باغ
بہار